امر جوت

(ایک سماجی ناول)

بنکٹ پرشاد

اظہارِ تشکر

میرے کرم فرما مولوی اکبرالدین صاحب صدیقی ایم اے لکچرار اردو سیف آباد کالج نے اس کتاب کی کتابت، طباعت اور ٹائٹل کی تیاری میں نہایت جانفشانی سے کام لیا۔ ہر ہر زینہ پر ان کی رہبری، ہمت افزائی اور دلجوی میرے ساتھ رہی۔ اصل یہ ہیکہ اگر ان کی ہمت افزائی ساتھ نہ ہوتی تو شاید میں اس کتاب کی طباعت کی ہمت نہ کرتا۔ میرے مشفق مولوی سید محمد صاحب ایم اے پرنسپل اردو کالج نے اپنی خاص نگرانی میں اعجاز پریس میں طباعت کا انتظام فرمایا۔ سید صاحب کی مہربانی اس قدر شامل حال تھی کہ مجھ کو پروف دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ مکرمی مولوی عوض سعید صاحب لکچرار فائن آرٹس کالج نے جو پرانے تجربہ کار آرٹسٹ ہیں۔ اپنی مہربانی سے کتاب کی موزونیت کے لحاظ سے دیدہ زیب ٹائٹل تیار فرمایا۔ مولوی احمد علی صاحب مالک نیشنل فائن آرٹ پریس نے نہایت جانفشانی سے ٹائٹل طبع فرمایا۔ اور منشی غلام علی صاحب نے بڑی محنت اور خندہ پیشانی سے کتابت کا کام انجام دیا۔

میں ان حضرات کا فرداً فرداً تہہ دل سے شکرگزار ہوں۔

بنکٹ پرشاد

کتابت : غلام علی

طباعت متن : اعجاز پرنٹنگ پریس، چھتہ بازار، حیدرآباد

سرورق : عوض سعید

طباعت سرورق : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان حیدرآباد

تعداد : ۵۰۰

قیمت : تین روپے

اکتوبر ۱۹۶۲ء

مُدّعا

اِس کتاب میں جو ایک ناول کی شکل میں پیش کیجا رہی ہے حالاتِ حاضرہ کے مسائل پیش کئے گئے ہیں۔ بے شک ہندوستان کی جدوجہدِ آزادی میں لاکھوں جانیں گئیں لاکھوں گھر تباہ ہوئے۔ لیکن حقیقت پوچھو تو ابھی ہندوستان آزاد نہیں ہوا۔ انگریز ہندوستان چھوڑ کر چلے گئے لیکن ہندوستان نے انگریز کو نہیں چھو ۔ گذری ہوئی نسل اِس خود فریبی میں ہے کہ اُس نے ہندوستان کو آزاد کرایا لیکن موجودہ اور آئندہ نسل کو اِس دھوکے میں نہیں رہنا چاہیے۔ تلخ حقیقت کو سامنے دیکھنا چاہیے اُس سے احتراز یا اجتناب گمراہی کا باعث ہوتا ہے۔ ابھی انگلستان کا پارلیمنٹری سسٹم ہم پر قائم ہے۔ ان کی زبان ابھی ہم کو شہد سے زیادہ شیریں اور اپنی ماں کی بولی سے زیادہ میٹھی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ابھی ہمارے دماغ انگلستان ہی کے بنائے ہوئے ہیں۔ ان دماغوں کو سفید کھادی میں لپٹنے سے ان کے آثار اور اطوار نہیں بدلتے۔ ہم انقلاب کی باتیں کرتے ہیں تو اُسی دماغ سے کرتے ہیں۔ گاندھی جی نے ہماری اس دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا لیکن ماحول کو وہ کیا کرتے۔

کم از کم موجودہ اور آئندہ نسل کو اس خود فریبی سے بچانا چاہیے۔

مذاہب کے تعلق سے عام طور پر اور مسلم بھائیوں کے تعلق سے خاص طور پر چند باتیں پیش کی گئی ہیں۔ ہاں میں ہاں ملانا اور منہ پر خوشامد کی باتیں کرنا دھوکا دینا ہے۔ تلخ حقائق سامنے رکھنا اچھی دوستی ہے۔ اور یہ حقِ دوستی ادا کرنا ہوگا کہ اپنے دوست کو جو حقیقت ہو بتا دی جائے۔ ہو سکتا ہے کہ بتانے والا خود غلط دیکھ رہا یا غلط سمجھ رہا ہو۔ لیکن جو کچھ اس کو نظر آرہا ہے اگر وہی وہ بتا رہا ہے تو یہ ایمانداری ہے۔

پاکستان کی اب بھی یہ منطق ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک الگ قوم اور ایک علٰحدہ تہذیب کے حامل تھے اور اب بھی ہیں اور پنڈت نہرو نے اپنی کتاب ڈسکوری آف انڈیا میں جس تہذیبی اور تاریخی بہاؤ کا ذکر کیا ہے" اور سلطان غوری سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک کے مسلم اقتدار کے دور" کو اس بہاؤ کا جزو بنا دیا ہے اسکو ماننے پاکستانی مسلمان تیار نہیں ہے (دنیا پاکستان از سید محمد تقی۔ ماہ نو کراچی اگست) اگر کوئی شخص حقائق خصوصاً تاریخی حقائق سے انکار کرتا ہے تو اس کو کون روک سکتا ہے۔ عربی، ترکی، مصری اور ایرانی تہذیب اور کلچر کو توڑ مروڑ کر اپنی کہنا اور اپنی ذاتی اصلی تہذیب و کلچر کو محض تبدیلِ مذہب کی بنا پر ٹھکرانا کوئی علٰحدہ تہذیب و کلچر ہو سکتا ہے تو پاکستانیوں کو ایسی تہذیب و کلچر مبارک۔ اس بنا پر ہندوستان کے ٹکڑے کرا لئے گئے۔ اگر پاکستانی مسلمان اپنے اس ادعا میں صداقت پر تھے تو تقسیم سے قبل اس ادعا کو ایمانداری کے ساتھ اس کے آخری منطقی نتیجہ تک پہنچانا چاہیے تھا۔ ایسا نہیں کیا گیا۔ پانچ کروڑ مسلمان جو اب ہندوستان میں ہیں اور اول درجہ کے شہری حقوق کے ساتھ ہندوستانی قومیت کا جزو بن گئے ہیں۔ کیا پاکستانی مسلمان ان سے یہی منطق منعلق کرنا چاہتے

ہیں۔ اس کتاب میں اس منطق کے مضر اثرات سے بچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ بے شک عرب تہذیب و کلچر کا ہندوستان پر اثر پڑا۔ ایرانی اور مغل تہذیب و کلچر کا ہندوستان پر اثر پڑا۔ خود انگریزی تہذیب و کلچر کا ہندوستان پر بُرا اثر پڑا ہے۔ ویسے ایک قوم کی تہذیب و کلچر کا دوسری قوم کی تہذیب و کلچر پر اثر پڑتا ہے۔ سیاسی تعلقات اور تمدنی میل ملاپ سے ایسا اثر پڑتا ہے اور صلاحیت کے مطابق ایسا اثر قبول کیا جاتا ہے۔ محض اس بنا پر بنیادی تہذیب و کلچر سے انحراف خودکشی کے مترادف ہو جاتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ کوا جب ہنس کی چال چلنے کی کوشش کرے تو ہنس کی چال تو نہیں آتی خود اپنی چال بھی بھول جاتا ہے۔ ہندوستان میں کرسچین ہیں۔ پارسی ہیں۔ بودھ ہیں۔ سکھ ہیں۔ کوئی ایسا دعویٰ نہیں کرتا۔ صرف خود غرض اشخاص مذہب کا حیلہ لے کر ذاتی منفعت کی خاطر آواز بلند کرتے ہیں۔ اس طرح خود ہندوؤں میں بھی پسماندگی اور پنچ جاتی کے حیلہ سے جلبِ منفعت کی کوشش کی جاتی ہے۔ اگر پاکستانی مسلمانوں کی منطق مان لیجائے تو نہ صرف کرسچین پارسی۔ بودھ اور سکھ کو ہوم لینڈ چاہیے بلکہ درج فہرست اقوام پسماندہ اقوام، برہمن، کشتری، ویش اور شودر کو بھی علٰحدہ علٰحدہ ہوم لینڈ چاہیے۔ ہندوستان میں تو چھوٹے سے چھوٹا فرقہ بھی اپنی جگہ ایک قوم کی حیثیت رکھتا ہے۔ موجودہ دنیا میں تو محدود قومیت کا تصور غائب ہوتا جا رہا ہے اور اس کی جگہ بین قومیت لے رہی ہے۔ ان حالات میں مذہب کی بنا پر قومیت کا نعرہ خودکشی کے مترادف ہے۔ اگر مذہب کی بنا پر پاکستان کے مسلمان ایک قوم ہیں تو افغانستان، ایران، ترکستان، عربستان، مصر، الجیریا، افریقہ کے مسلمان اور انڈونیشیا کے مسلمان نیز دیگر ممالک کے مسلمان سب ملکر ایک قوم ہو جانا چاہیے۔ اور سب کی تہذیب و کلچر یکساں ہونا چاہیے۔ لیکن واقعہ اس کے برعکس ہے۔

نظریات کی رَو میں بہہ جانا فلسفی کے لئے زیب دیتا ہے۔ لیکن مدبر حاکم اور ایڈمنسٹریٹر کیلئے

یہ خطرناک بات ہے۔ قوموں کو نظریات کا تختۂ مشق بنانے کی اجازت نہیں دیجا سکتی۔ قوم تو مثل پودے کے ابھرتی اور پھلتی پھولتی ہے۔ پودے کے لئے امونیم سلفیٹ اور سُپر فاسفیٹ اتنا ہی دیا جائے کہ وہ صحیح معنی میں پھلے اور پھولے۔ یہ نہیں کہ حیثیت سے زیادہ موٹا ہو جائے یا بے مزہ پھل دینے لگے۔ ہمارے یہاں مشکل یہ ہے کہ ایک طرف قدیم دور میں رکھنے کی کوشش کیجاتی ہے تو دوسری طرف ایک ایسی قوم کو جو صدہا برس کی غلامی کے بعد قید خانہ سے باہر آئی ہے جہاں ابھی قیدی کی ذہنیت نہیں گئی جس میں ابھی متعدد بیماریاں جسمانی اخلاقی اور دماغی ہیں اس کو اسٹنگ میں اڑانے کی کوشش کیجا رہی ہے۔ جبکہ ہمکو دنیا کی طاقتور اور ترقی یافتہ قوموں سے بہت کچھ سیکھنا ہے لیکن سیکھنا پڑیگا شاگرد بنکر۔ ابھی قید خانہ سے باہر نکلکر پورے پرندے نہیں ہوئے ذرا سنبھلنے، پر صاف کرنے اور پر تولنے کا موقع تو دیجئے۔ ذرا ہمارے پیر تو زمین جمنے دیجئے۔ ذرا بازوؤں کو تو مضبوط ہونے دیجئے۔ نقلی تیل، نقلی دودھ، نقلی گھی سے ہم کو بچائیے۔ نقلی دوائیوں سے نجات دلائیے۔ ذرا اصلی دودھ اصلی گھی اور اصلی تیل تو کھانے دیجئے۔ ہمارے اپنے بوتے میں ہمکو سنبھلنے کا موقع دیجئے پھر دیکھئے کہ ہم کیسے اڑتے ہیں۔ اور کتنا اوپر اڑ سکتے ہیں۔ عمدہ جینا تو سب ہی چاہتے ہیں اور سب ہی کوشش کرتے ہیں کہ کسطرح جئیں لیکن ہمکو یہ سیکھنا ہے کہ مریں کسطرح کونسی موت شاندار ہوگی۔ کونسی موت باعث خوشی اور اطمینان کی ہوگی۔ ایثار اور بلیدان کی لذت معلوم کرنا ہے جس قوم کو ایثار اور بلیدان میں لذت نہ ملے وہ قوم زندہ نہیں رہ سکتی۔ قوم کے ہر فرد کو ایثار اور بلیدان میں لذت محسوس ہونی چاہیے۔ وہی قوم اٹھ سکتی ہے۔ قوم کا ہر فرد چھوٹا ہو یا بڑا امیر ہو یا غریب "ہل من مزید" میں لگا ہوا ہے۔ پھر قوم کس طرح اٹھ سکتی ہے۔ کوئی غریبی کا سہارا لیکر "ہل من مزید" کہتا ہے۔ کوئی ذات پات کا حیلہ لیکر "ہل من مزید" پکارتا ہے۔ کوئی مذہب کے نام پر "ہل من مزید" چیختا ہے۔ کوئی زبان کی بنا پر "ہل من مزید" الاپتا ہے۔ غرض دنیا میں جتنے حیلے ہو سکتے ہیں ایک ایک کرکے "ہل من مزید" استعمال کئے جاتے ہیں۔ اسطرح ہمارا پورا ماحول "ہل من مزید" کا بنا ہوا ہے۔ از مہد تا لحد یہ ماحول ہو تو نہ فرد اونچا ہو سکتا ہے اور نہ قوم جو ایسے افراد پر مشتمل ہو۔ اس ماحول کو یکلخت بدلنے کی ضرورت ہے۔ صحیح تعلیم ہی اس ماحول کو بدل سکتی ہے۔ اس کتاب میں اس نقطۂ نظر کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے

اس کتاب میں جو واقعات مقامات اور نام دیے گئے ہیں وہ سب فرضی ہیں۔

امر جوت

اس سال شعبان کی ۳۰ تاریخ کو عید کا چاند نظر آیا۔ چاند نہایت صاف اور شفاف تھا۔ ابوالبہا افتخار الدین کے صرف ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھی لڑکے کا نام قمر زبیری اور لڑکی کا نام ریحانہ۔ ریحانہ قمر سے چھوٹی تھی۔ صرف ڈیڑھ سال کا فرق ہوگا۔ ریحانہ اور کرانتی بچپن سے کلاس میٹ رہیں۔ کالج میں آنے کے بعد ان کے مضامین بدل گئے۔ ریحانہ نے بی۔ اے میں پولٹکس لیا تھا۔ گھر بار کی پیاری لڑکی تھی۔ باوجود امتحان کے اس سال اس نے پورے روزے رکھے تھے۔ عید کی اصلی اور سچی خوشی ان لوگوں کو ہوتی ہے جو پورے روزے رکھتے ہیں۔ قمر صاحب بیچ بیچ میں کبھی عشرہ دیدیتے تھے۔ دوسرے دن عید کی زوردار تیاریاں ہوئیں۔ دو روز قبل ہی سے دودھ جمع کر لیا گیا تھا۔ شیر خرما عید کے کھانے کا جزو لاینفک ہے۔ کرانتی اتفاق سے عید کے دن ریحانہ کو عید کی مبارک باد دینے نہ جا سکی۔ ریحانہ نے خاص طور پر اس کے لئے شیر خرما اٹھا رکھا تھا۔ لیکن کرانتی اس دن ایک ایسی دعوت میں گھٹ گئی تھی کہ وہ نکل ہی نہ سکی۔ دوسرے ہی دن صبح کرانتی ریحانہ کے مکان عید کی مبارک باد دینے پہنچی۔

کرانتی۔ ہلو ریحانہ عید مبارک عید مبارک۔

ریحانہ۔ شکریہ کرانتی بہت بہت شکریہ۔ بیٹھو میں ابھی آئی۔ ذرا بال صاف کر کے آتی ہو۔ ابھی حمام کیا ہے۔ دیکھو یہ ماہ نو کا پرچہ دھرا ہے دیکھتی رہو ابھی میں پانچ منٹ میں آتی ہوں۔

کرانتی صوفہ پر ڈرائینگ روم میں بیٹھ گئی۔ سامنے میز پر ماہ نو کا پرچہ پڑا تھا۔ یہ پرچہ کراچی سے نکلتا ہے۔ مخصوص نمبر تھا۔ جس میں بنیادی جمہوریت پر آرٹیکل آیا تھا۔

ریحانہ۔ ہاں تو میں آگئی۔ معاف کرنا کرانتی تم کو دس منٹ انتظار کرنا پڑا۔ آج دیکھو لیلا بھی آنے والی ہے۔ کہو کیا ارادہ ہے پکچر چلیں گے۔

کرانتی۔ ریحانہ۔ ایوب نے تو کمال ہی کر دیا۔ آخر ڈیماکریسی بنا ہی ڈالی۔ بیسک ڈیماکریسی پر معاف کرنا بہن۔ میں تو سائنس کی اسٹوڈنٹ ہوں مجھ کو بیسک ڈیماکریسی کیا بات ہے سمجھ میں نہیں آتی۔

ریحانہ۔ ارے کرانتی تو نے تو کالج کا نام ڈبو دیا۔ ارے تو گرائجویٹ ہے سائنس کی گرائجویٹ۔ کیا تو اتنا بھی نہیں سمجھتی کہ ڈیماکریسی کیا چیز ہے۔ ڈیماکریسی کو اپنی زبان میں جمہوریت۔ جنتا راج۔ جنتا کی حکومت۔ خود جنتا کے لئے حکومت کہتے ہیں۔

کرانتی۔ نا۔ بابا نا۔ مجھ کو یہ لفظی ہیر پھیر نہیں آتا اور نہ مجھے کوئی لفظی ہیر پھیر میں ڈال کر چکر دے سکتا ہے۔ میں سائنس کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ میرے پاس دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ نہ تین ہو سکتے ہیں اور نہ پانچ۔ میرے پاس ہر دعوی کا پکا ثبوت ہونا چاہیئے۔ بتا جنتا کا راج کہاں ہے۔ یا کہیں تھا بھی۔ بس تم جیسے پڑھے

حیلے اور بہانے نکال لیے ہیں جنتا کو بیوقوف بنانے کے۔ جنتا سے کہا کہ تمہاری حکومت بنانی ہے رائے دو۔ کہا کہ پھول کو ووٹ دو، بیل کو ووٹ دو یا بھالا کو ووٹ دو۔ بے چاری جنتا کو کچھ نہیں معلوم کہ کیا ہو رہا ہے۔ ان پر تو ایک آفت آتی ہے۔ ہر پانچ سال بعد ان کو اس آفت سے گزرنا پڑتا ہے۔ ووٹ کیا ہے بس جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ پورا ملک ایک اکھاڑا بن جاتا ہے۔ دنگل میں پہلوانوں کے پرے کے پرے اترتے ہیں۔ غریب شریف قوم اور ملک کے خدمت گذار دنگل کو دیکھکر چوہوں کی طرح بلوں میں روپوش ہو جاتے ہیں۔ جنتا بے چاری کیا کرے جو زور سے ڈنکا بس اسی کو ووٹ دیدیا اور اپنی جان چھڑالی۔ ایسے موقع پر چلتے پرزوں کی بن آتی ہے۔ کمانے کا سیزن ہوتا ہے۔ پانچ سال میں ایک بار۔ لگے ہاتھ بنالو۔ ان چلتے پرزوں کے سامنے دنگل کے بڑے بڑے سورما بھی گھٹنے ٹیکتے ہیں۔ رقم دے جاؤ حساب نہ پوچھو۔ اگر کسی قسمت کے مارے نے حساب پوچھنے کی ہمت کی تو رقم بھی گئی اور ووٹ بھی غائب۔

ریحانہ۔ ارے کرانتی تم نے غضب ہی کیا۔ ڈیماکریسی کے متعلق تم کو اتنا سب کچھ معلوم۔ اور پھر تم کہتی ہو کہ کچھ نہیں جانتی۔

کرانتی۔ نا۔ بابا نا۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔ میں نے تو جو آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا۔ بیان کر رہی ہوں۔ تمہارے داؤ پیچ کی باتیں اور سیاسی الٹ پھیر نہیں معلوم۔

ریحانہ۔ ہاں بہن۔ یہی تو بات تھی کہ پاکستان میں کئی مرتبہ حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش ہوئی۔ وزیروں کے قتل ہوئے اور بالآخر ڈکٹیٹر شپ قائم

ہوئی۔ دوسرے ایشیائی ممالک میں بھی یہی ہو رہا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ڈیماکریسی کوئی چیز نہیں یا ڈیماکریسی بے کار ہے۔ دیکھو کرانتی میں تم کو صرف سائنس کے اسٹوڈنٹ کی حیثیت سے ہی کہہ رہی ہوں۔ چند باتیں تم کو ذہن میں رکھنا چاہیئے۔ مسلمانوں کی حکومت سے پہلے۔ نہیں میں نے غلط کہا۔ مغلوں کی حکومت سے پہلے عربوں کے حملوں سے پہلے۔ بلکہ تاتاریوں کے حملوں سے پہلے ہندوستان میں کچھ حکومتیں تھیں۔ لفظ "مسلمان کی حکومت" کو میں عمداً نظر انداز کر رہی ہوں اسلئے کہ یہ الفاظ عمداً یا نادانستہ طور پر استعمال کئے گئے ہیں۔ حضرت محمدؐ کے زمانہ میں اور اس کے بعد خلفائے راشدین کے زمانہ میں یورپ میں اسپین سے لیکر ایشیا میں چین تک عربوں کی حکومت پھیلی۔ مسلمانوں نے بحیثیت مسلمان ہندوستان پر حملہ نہیں کیا۔ یہ صرف اتفاقات اور مقدرات تھے کہ ہندوستان میں غزنوی، غوری حملہ آور ہوئے مغلوں نے حکومت قائم کی۔ یہ حملے کیوں ہوئے، کس طرح ہوئے اور کس طرح مغلوں کی حکومت قائم ہوئی۔ اس میں اب جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مطلب صرف اس قدر ہے کہ مغلوں وغیرہ سے پہلے ہندوستان میں وہ ڈیماکریسی نہیں تھی جس کو ہم ڈیماکریسی سمجھتے ہیں۔ مغلیہ دور میں صرف راج شاہی تھی۔ پھر یورپین اور انگریز آئے بحیثیت تاجر۔ ان کے پاس بھی راج شاہی تھی۔ ابھی وہاں بھی ڈیماکریسی کا وجود نہیں تھا۔ فرانس میں انقلابات ہوئے۔ انگلستان میں انقلابات ہوئے۔ امریکہ دریافت ہوا۔ امریکہ میں خود انقلاب ہوا۔ امریکہ آزاد ہوا یورپ سے۔ انگلستان میں راج شاہی بادی گئی۔ فرانس میں راج شاہی ختم ہوئی۔ روس میں انقلابات شروع ہوئے۔ انگریزوں نے راج شاہی کا بدل ڈیماکریسی تجویز کیا جس وقت انگریزوں نے راج شاہی کا بدل ڈیماکریسی تجویز کیا

ان کے پاس دنیا کا بہت حصہ آچکا تھا۔ اس لئے ان کا ملک ایسے انقلاب برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ جو فرانس یا روس میں ہوئے۔ علاوہ ازیں یہ قوم دراصل قوم تھی سنجیدہ۔ ٹھنڈے دل والی اور کاروباری ذہنیت کی۔ اس پر چھوٹا سا ملک۔ پھر بھی ان کو اسکاٹ سے مقابلہ اور آیرلینڈ سے ٹکر لینی ہی پڑی۔ بہرحال انگریزوں سے پہلے ہمارے پاس راج شاہیاں تھیں۔ انگریزوں کی دو سو برس کی حکومت میں ہم نے ان کی زبان سیکھی۔ ان کا طرزِ حکومت جانا۔ ان کی ڈیماکریسی سے واقف ہوئے۔ ان کی تاریخ سے باخبر ہوئے۔ اور ڈیماکریسی کا تصور بھی ہم نے اپنانے کی کوشش کی۔ کچھ انہی کے بتائے ہوئے اصولوں پر ذمہ دارانہ حکومت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ پھر ایک عجیب و غریب ہستی ہندوستان کے افق پر نمودار ہوئی جس نے ہندوستان کی جدوجہدِ آزادی کو نیا رنگ دیدیا۔ یہ بالکل انوکھا رنگ تھا جو خود انگریزوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ دوسری جنگِ عظیم نے انگریزوں کو مجبور کر دیا کہ اپنے پاؤں نزدیک کرلیں۔ انھوں نے نہایت ہوشیاری سے اپنے پاؤں نزدیک کرلئے۔ دنیا سے راج شاہی تقریباً برخاست ہو چکی تھی۔ ہندوستان میں بہادر شاہ کا کوئی قائم مقام نہ تھا جسکے حوالے حکومت کیجاتی۔ راجہ رجواڑے سب آزاد کر دیئے گئے جن کی حالت پنجرے میں بند طوطوں کی تھی۔ عام ہندوستان کا یہ حال تھا کہ ایک طرف حقیقی قوم پرست سرفروش محبِ وطن ہندوستان کی آزادی کے لئے جان کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ تو دوسری طرف خود غرض غدار قوم کبھی مذہب کے نام پر کبھی فرقہ یا جماعت کے سہارے حب الوطنی کا لبادہ اوڑھے حصے بخرے کی فکر میں لگے ہوئے تھے۔ جنگ جیتنے کے دو طریقے ہیں یا تو دشمن سے مقابلہ کر کے اس کو ختم کیا جائے۔ یا اس کو اس قدر تھکا دیا جائے اور جنگ کو اس قدر طوالت دی جائے کہ دشمن خود بخود ختم ہو جائے۔ محبانِ وطن نے

تھا کہ ہندوستان کے دو ٹکڑے ہونا مان لیا۔ ہندوستان کے دو ٹکڑے ہوئے۔ لیکن خود غرض اور غداروں سے پھر بھی پیچھا نہیں چھوٹا۔ پاکستان میں آپس میں حصے بخرے کے لئے جوا چلتا رہا۔ وہی اندھیر نگری شروع ہوئی۔ رعایا تنگ آگئی۔ ملک تباہ ہو گیا۔ نتیجہ قتل غارت گری اور پھر ڈکٹیٹرشپ۔ خوش قسمتی سے ہندوستان میں چوٹی پر کچھ سرفروش محبِ وطن جاں نثار موجود تھے۔

کرانتی ۔ اچھا بی بی یہ بتاؤ کہ پاکستان بنانے کے کون ذمہ دار۔ لوگ کہتے ہیں کہ مسٹر جناح نے پاکستان بنایا کیا یہ صحیح ہے۔

ریحانہ ۔ نہیں کرانتی ایسا نہیں ہے۔ مسٹر جناح ایک بیرسٹر۔ انگریزیت میں ڈوبا ہوا انسان پوری زندگی ان کی انگریزیت سے بھری ہوئی۔ یوں سمجھو کہ انگلش ڈیماکریسی کی ایک خالص پیداوار۔ ایسا شخص کس طرح مذہب کی بنا پر ملک کی تقسیم کرا سکتا تھا۔ پھر زندگی کا بہترین حصہ بہ حیثیت قوم پرست کے گزرا۔ بات یہ ہے کہ مسٹر جناح بالکل ایک دنیا دار آدمی مغربی تہذیب کا نمونہ۔ اس زمانہ کی کانگریس کے بہت بڑے ستون تھے۔ میں سمجھتی ہوں کہ گاندھی جی کے کانگریس میں دخل نے ایک بہت بڑا انقلاب پیدا کر دیا۔ مسٹر جناح کی خودداری اور انگریزیت اس طوفان کی متحمل نہ تھی۔ دوسرے یہ کہ خود کانگریس میں ایسے عوامل آگئے تھے جن کو جناح کی خودداری برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسٹر جناح کانگریس سے ہٹتے گئے۔ باوجود اس کے یہ امر مسٹر جناح کے تدبر اور شخصی تربیت کے برعکس تھا کہ وہ مذہب کو حکومت کی بنیاد بناتے۔ کم از کم میں ایسا سمجھتی ہوں۔ پاکستان کا شاخسانہ کہیں اور سے نکلا تھا۔ کانگریس میں جو زبردست انقلابیت پیدا ہو رہی تھی اس کا مقابلہ کرنے کے لئے مسٹر جناح کے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا۔ مسٹر جناح کے لئے یہ انتہائی پریشانی

کا زمانہ تھا کہ کس طرح اس انقلاب کا مقابلہ کیا جائے۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مسٹر جناح نے اس حربہ کو بطور اسسٹنٹ کے استعمال کیا۔ اور حربہ چل گیا۔

کرانتی۔ بی بی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم اس زمانہ کے انقلابی دور سے خود گزری ہو۔

ریحانہ۔ نہیں کرانتی۔ میں نے ابا سے سنا ہے۔ میرے ابا اس زمانہ کے انقلاب میں شامل تھے۔ ابھی ابا آئیں گے تم ان سے سننا۔

ریحانہ کے والد ابوالبہا افتخارالدین پیچھے کے کمرے سے دیوان خانے میں داخل ہوئے۔

ابوالبہا افتخارالدین۔ اوہو کرانتی۔ بہت دن بعد نظر آئیں۔ کہو اچھی تو ہو۔ کیا تمہارے امتحان کا نتیجہ نکلا۔ بھئی تو تو بچپن سے تیز ہے۔ پرچے اچھے ہی کئے ہوں گے۔

کرانتی۔ ہاں چاچا جی میں نے بایو کمسٹری میں B.S.c کا امتحان دیا ہے۔ آپ کی دعا سے میں نے فرسٹ کلاس حاصل کیا ہے۔

ابوالبہا۔ شاباش بیٹا شاباش تم سے یہی امید تھی۔ بھئی تو تو بچپن سے کتاب کا کیڑا بنی رہتی ہے۔ لو ہماری مبارک باد اور دعائیں۔ تمہارے پتاجی کو بھی ہماری طرف سے مبارک باد پہنچا دینا۔ کہو سنہا جی آج کل کیا کر رہے ہیں۔ وہ تو گھر سے باہر نکلتے ہی نہیں۔ ہائے وہ بھی کیا زمانہ تھا۔ تمہارے پتاجی اور ہم گھنٹوں کیچا بیٹھے رہتے تھے۔ وہ گپیاں لگتی تھیں کہ کیا بتائیں۔ معمولی روزمرہ کی باتوں سے لے کر پالیٹکس تک۔

ریحانہ۔ ابا۔ میں کرانتی سے ابھی کہہ رہی تھی کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے کے انقلابی دور

کی باتیں آپ سے سنیں۔ ماہ نو کے پرچے میں بنیادی جمہوریت جو پاکستان میں لائی جا رہی ہے اس کے متعلق ایک مضمون آیا۔ کرانتی نے اسے دیکھا۔ اتنے میں میں آ گئی۔ پس ڈیماکریسی کی بحث چھڑ گئی۔ اس سلسلہ میں ہندوستان میں انقلاب کا ذکر آ گیا۔

ابوالبہا۔ ارے بیٹا۔ میں تمہیں کیا بتاؤں۔ بڑی دردناک کہانی ہے۔ اور سبق آموز بھی۔ بہت اچھا ہوا تم لوگوں نے یہ ذکر چھیڑ دیا۔ تم لوگوں کو یہ باتیں معلوم ہونی چاہئیں۔ تم کو تو معلوم ہے کہ انگریزوں کی آمد سے پہلے ہندوستان کا کیا حال تھا اور انگریزوں کی آمد کے بعد کیا حال ہوا۔ یہ سب ہندوستان کی ہر تاریخ میں لکھا ہے۔ ہم نے انگریزی زبان کے ساتھ ان کا طرز حکومت بھی سیکھا۔ انگریز جس طرح اپنی پارلیمنٹ میں حقوق کے لئے لڑا کرتے تھے ہم نے بھی لڑنا سیکھا۔ ڈیماکریسی اور آزادی کا جو مفہوم انگریزی میں تھا اس کو ہم نے اپنانے کی کوشش کی۔ لیکن کدھر انگلش پارلیمنٹ اور کدھر ہندوستان کی حکومت۔ وہاں تو انگریز کا انگریز سے مقابلہ۔ انگریزی حکومت۔ انگریزی جنتا۔ ادھر انگریزی حکومت اور ہندوستانی جنتا۔ کش مکش شروع ہوئی۔ ظاہر ہے کہ حکومت کی زبردست مشنری کے مقابلہ میں جنتا کہاں ٹھہرتی۔ جنتا بھی ایسی جنتا جو متعدد مذہبوں، سیکڑوں فرقوں میں منقسم ہو۔ پہلے تو بے ہتیار، دوسرے ایک فرقے کو دوسرے فرقے سے لڑا دو ایک مذہب والے کو دوسرے مذہب والے کے مقابلہ میں کھڑا کر دو۔ بس ہینگ لگے نہ پھٹکری۔ خود آپس میں لڑ مریں گے۔ ایک گولی بھی چلانا بے سود۔ دوسری طرف جو انگریزی پڑھے لکھے تھے لیکن سنجیدہ قسم کے لوگ وہ پارلیمنٹری پراکسس کے داؤ پیچ میں پھنس گئے۔ ایسے موقع پر ہندوستان کی تحریک جدوجہد آزادی میں گاندھی جی کے دخل نے ہندوستان کی انقلابی تحریکات کو ایک نیا رنگ دیدیا۔ گاندھی جی نے دو باتیں بتائیں۔ پہلی بات یہ کہ کسی کام کے کرنے کی دوسروں کو ہدایت کرنے سے

پہلے یہ دیکھ لو کہ خود بھی وہ کام کر سکتے ہو یا نہیں۔ اگر تم خود کسی کام کو دس حصے کر سکتے تو دوسروں سے ایک حصے کی توقع رکھو۔ دوسری بات یہ کہ نہ صرف مقصد نیک ہو بلکہ حصولِ مقصد کا ذریعہ بھی اتنا ہی نیک ہونا چاہیئے۔ ہاں ایک اور بات جو انہوں نے کہی نہیں لیکن کہنے کے برابر ہے وہ یہ کہ ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے ہو تو ہندوستانی بنو۔ انگریز بن کر ہندوستان کو آزاد نہیں کرا سکتے۔ ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں ایک نیا انقلاب آگیا۔ جس کو مغرب کے ممالک نے نہ دیکھا تھا نہ سُنا۔ ستیاگرہ، سیول نافرمانی، مرجاؤ اور مسکراؤ، مارو نہیں۔

اس عرصہ میں دوسری جنگِ عظیم بھی ختم ہو گئی۔ انگریز کچھ اپنی مصلحت کے تحت بھی ہندوستان چھوڑنا چاہتے تھے۔ بلکہ وہ ایشیا سے آہستہ آہستہ ہٹنے کی فکر میں تھے۔ بس خود غرض اشخاص کے لئے سنہرا موقع ہاتھ آیا۔ تقسیمِ ہند کا نعرہ بلند ہوا۔ معاف کرنا میں بھی اس چکر میں آگیا۔ کیسے نہ آتا۔ روزآنہ فرقہ وارانہ فسادات۔ ہندو مسلمان کے خون کے پیاسے اور مسلمان ہندو کے خون کا پیاسا۔ غنڈوں کا راج جہاں دیکھو مجارٹی کا چرچا، مجارٹی کی حکومت کا ذکر۔ مینارٹی مجارٹی کے رحم و کرم پر۔ اور یہ تو بالکل موٹی بات تھی جو معمولی سی معمولی سمجھ کا آدمی بھی سمجھ سکتا تھا۔ بس ہمارے ذہن میں بھی یہ بات بیٹھ گئی۔ حالانکہ تمہارے والد سنہا جی نے اس کے خلاف ہمیں بہت کچھ سمجھایا۔ لیکن ہم نے ان کی ایک نہ سنی۔ ہم اس وقت کچھ ایسے بہہ گئے تھے۔

کرانتی۔ پتاجی نے آپ سے اس بارہ میں کیا کہا تھا۔ انھوں نے تو ہم سے کبھی ذکر نہیں کیا۔

ابوالبہا۔ کیا بتاؤں بیٹا۔ تمہارے پتاجی کی بات نہ سُن کر آج ہم پچتا

رہے ہیں۔ تمہارے پتاجی کہتے تھے کہ ہندو مسلمان کا جھگڑا ہی بے معنی۔ جھگڑا جھگڑا ہی نہیں ہے۔ وہ کہتے تھے کہ ہندو دھرم فلسفۂ حیات و ممات ہے جو اسلام اور عیسائیت سے بہت پہلے پیش ہوا۔ رشیوں مُنیوں نے ویدوں اور اُپنشدوں میں فلسفۂ حیات و ممات بیان کیا۔ انکے یہ بیانات مافوق الشعور تھے جو آج بھی اپنی جگہ قائم ہیں نہ اسلام نے ان کی تردید کی اور نہ عیسائیت نے۔ اور تردید ہوتی بھی کیسے جب اسلام اور عیسائیت خود مافوق الشعور بیانات ہیں۔

اگر ہندوؤں کو مسلمانوں سے درحقیقت کوئی جھگڑا تھا تو عربوں سے، مصریوں سے، ایرانیوں سے اور دنیا کے دیگر مسلمانوں سے بھی ہونا چاہیئے۔ ان سب سے تو کوئی جھگڑا نہیں۔ جھگڑا ہو تو صرف ہندوستان کے مسلمانوں سے جو خود ان کا اپنا خون خود اُن کی اپنی نسل ہیں۔ یہ تو بالکل مہمل سی بات ہے۔ تمہارے پتاجی بڑے فریس آدمی ہیں۔ بڑا ہی دُور اندیش دماغ پایا ہے۔ کہتے تھے کہ ہندو اور مسلمانوں میں ایک معنی کر کے جھگڑا ہے بھی یا جھگڑا کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ انگریزوں سے پہلے یہاں جو حاکم یا بادشاہ تھے وہ ذات کے مغل تھے۔ یہ مغل بادشاہ اتفاق سے مسلمان بھی تھے۔ ظاہر ہے کہ بادشاہ کے دین کا رعایا پر اثر پڑتا ہے۔ بہت سے عرب و مغل مسلمان ہندوستان آئے۔ بہت سے خود ہندوستانی مسلمان ہو گئے۔ جب انگریز کے ہندوستان چھوڑنے کی نوبت آئی تو ہندوستان کے مسلمانوں کو صحیح یا غلط طور پر یہ خدشہ تھا کہ مغل بادشاہوں کے زمانہ میں جو شکایات ہندوستان کی ہندو رعایا کو تھیں ممکن ہے کہ اس کا بدلہ ہندو رعایا مسلمانوں سے لے۔ اور انگریزوں نے اپنی حکومت قائم رکھنے کی خاطر اس پہلو کو زیادہ نمایاں کر دیا تھا۔ لیکن اہم پہلو جس

آپ کے پتاجی زور دیا کرتے تھے ان مسلمانوں کا ہے جو ہندو سے مسلمان ہو گئے۔ چین میں مسلمان ہیں، جاپان میں مسلمان ہیں روس میں مسلمان ہیں۔ سارے یورپ میں مسلمان ہیں۔ نہ چینی مسلمانوں نے چینی کلچر چھوڑا، نہ جاپانی مسلمانوں نے جاپانی کلچر چھوڑا، نہ روسی مسلمان نے اپنا روسی کلچر چھوڑا۔ سارے یورپ کے مسلمانوں میں کسی نے بھی اپنا کلچر نہ چھوڑا۔ اگر روس میں کسی مسلمان نے اپنے ملک و قوم کا کلچر چھوڑا ہے تو وہ ہندوستان کا مسلمان ہے۔ اس نے نہ صرف اپنے ملک و قوم کا کلچر چھوڑا بلکہ اپنے ملک و قوم کے کلچر کو ایک حد تک حقارت سے دیکھنے لگا۔ آج جو دین دیال تھا کل مسلمان ہوتے ہی اپنا نام عبداللہ رکھا۔ دھوتی اُتار پھینکی۔ لنگی یا پاجامہ پہنا۔ جو زمین پر تپل یا تھالی میں کھانا کھاتا تھا، بور یئے پر رکابیوں میں کھانا کھانے پر فخر کرنے لگا۔ اپنی مادری زبان سے نفرت کرنے لگا۔ ظاہر ہے کہ اس طرزِ عمل سے اس کے بھائی رام دیال کو دکھ ہوا اور بہت دکھ ہوا۔ اس پہلو پر آپ کے پتاجی نے بہت روشنی ڈالی اور ہم کو بہت سمجھایا۔ لیکن ہم کچھ ایسے بہہ گئے تھے کہ ہم کو وقت پر سمجھ نہ آئی۔

ایک اور بات آپ کے پتاجی نے کہی تھی وہ یہ کہ ان تو ہندوستان کی تقسیم کر کے ہندو اور مسلمان ہندوستان کو آپس میں بانٹ لیں تو کیا ممکن ہے کہ سارے کے سارے مسلمان ایک حصہ میں چلے جائیں گے اور سارے ہندو دوسرے حصہ میں آئیں گے۔ لاکھوں بے گناہ مارے گئے۔ ہزاروں بے گھر ہوئے۔ ماؤں، بہنوں کی عزت ریزی ہوئی۔ پھر بھی کیا مسئلہ حل ہوا۔ مسئلہ جیسے کا تیسا۔ پانچ کروڑ مسلمان ہندوستان میں اور اسی لاکھ ہندو پاکستان میں۔ پھر ماشاءاللہ سے یہ پانچ کروڑ مسلمان دن دونے رات چوگنے بڑھ رہے ہیں۔ فیملی پلاننگ کا کوئی اثر نہیں۔ آخر پاکستان کے مسلمان

کیا ان کو مردہ سمجھے ہوئے ہیں۔

آپ کے پتاجی کی ایک ایک بات صحیح ثابت ہوئی۔ میں تو بہت شرمندہ ہوا پر کیا کرتا۔ ع مُشتے کہ بعد از جنگ یاد آید بر کلّہ خود باید زد۔

کرانتی۔ اچھا چاچا جی اب میں رخصت ہوتی ہوں آپ نے تو ہماری آنکھیں کھول دیں۔

ریحانہ۔ واقعی۔

کرانتی۔ اچھا ریحانہ۔ اب میں جاتی ہوں۔ بہت دیر ہو گئی۔ پتاجی کھانے پر میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔

کرانتی ریحانہ کے گھر سے باہر نکلی۔ ابھی اندھیرا نہیں ہوا تھا۔ ابر چھایا ہوا تھا ہوا تیز چل رہی تھی۔ بارش کے آثار تھے۔ کچھ بوندیں بھی گریں۔ ریحانہ کا گھر نخاری کے ناکہ کے پاس تھا۔ وہاں سے کرانتی کا مکان کوئی ایک میل ہو گا۔ بی بی کے الاوہ کے پاس۔ ایک رکشا والا نظر آیا۔

کرانتی۔ اے رکشا، اے رکشا۔

رکشا والا۔ جی۔ بی بی جی۔ میں رکشا والا ہوں۔ رکشا نہیں ہوں۔

کرانتی۔ ارے بابا۔ بُرا نہ ماننا۔ میں نے رکشا والے کو چھوٹا کر کے صرف رکشا کہہ دیا۔ اس میں بُرا ماننے کی کیا بات۔

رکشا والا۔ بی بی جی۔ آخر آپ نے چھوٹا ہی کر دیا۔ ہم غریب آدمی ہیں۔ محنت سے روٹی کماتے ہیں۔ خیر۔ آپ نے چھوٹا کر دیا یا بڑا۔ ہم کو تو محنت کرنے اور روٹی کمانے سے مطلب۔ بی بی جی معاف کرنا۔ اب تو بڑے بھی چھوٹے ہو رہے ہیں۔

کرانتی۔ اچھا بھئی بی بی کے الاوہ کے پاس چھوڑنے کیا لوگے۔

رکشا والا۔ بی بی جی۔ آٹھ آنے۔

کرانتی۔ یہاں سے بی بی کے الاوہ کو کرایہ چار آنے بھی نہیں ہوتا۔ تم آٹھ آنے مانگتے ہو۔ پھر تم اپنے کو غریب اور قابل رحم کہتے ہو۔

رکشا والا۔ بی بی جی۔ وقت وقت کی بات ہے۔ کبھی ہم کو دو آنے ہی میں جانا پڑتا ہے۔ کبھی آٹھ آنے مل جاتے ہیں۔ اچھا آپ پانچ آنے دینا۔ بیٹھ جائیے۔

کرانتی رکشا میں بیٹھ گئی۔ رکشا والا رکشا چلانے لگا۔ ایک دم زور دار بارش شروع ہوئی۔

رکشا والا۔ دیکھئے بی بی جی اب اس موسلا دھار بارش میں بھیگتے ہوئے ان پھٹے پرانے کپڑوں میں رکشا چلانا۔ اب ہم کو نمونیا ہو جائے، بخار آجائے۔ کون ہماری خبر گیری کرنے والا۔ رات دن محنت کرتے ہیں۔ بمشکل چار روپے ملتے ہیں۔ اس میں ایک روپیہ چار آنہ تو مالک کو چلے۔ رکشا کی چھوٹی موٹی خرابی ہم کو اپنے خرچ سے کرنی پڑتی ہے۔ پھر خدا بھلا کرے۔ ہماری ماں جی اور بہن جی کا چار چار پانچ پانچ۔ گود میں ایک ایک بچہ پاؤں کے پاس دو دو بچے اس طرح رکشا میں لد جاتی ہیں۔ جیسے تھیلے میں روئی بھری جا رہی ہے۔ پتہ ایک بتاتی ہیں، لیجاتی ہیں دوسری طرف۔ کسی گلی کوچہ میں جہاں رکشا جا نہیں سکتی۔ اگر جائے تو اس کے کاڑیاں ٹوٹ جائیں، ٹائر پھٹ جائے۔ پھر رکشا سے اترنے کے بعد کرایہ کی الگ جھک جھک شروع ہوتی ہے۔ بات کرتی ہیں آٹھ آنہ اور اترتے وقت دیتی ہیں چھ آنے۔ ہم بھی آدمی بشر گنوار ٹھیرے۔ لاچار ہو کر کچھ بولے تو چلو قصہ کھڑا ہو گیا۔ رکشا والا بدمعاش ہے۔ لفنگا ہے۔ چار لوگ جمع ہو گئے۔ اور ہم پر ہی برس پڑے۔ ادھر سے پولیس کا جوان آیا۔ چار گالیاں

ہم کو ہی سنائیں۔ رکشا بلا نمبر کی۔ اب پولیس کے جوان کو چائے کی پیالی پلانا۔ نہیں تو تھانے کی ہوا کھانا۔ بتاؤ بی بی جی ہم کیا جینا۔ گھر میں چار بچے۔ گھر والی بازو کے گھر میں ماما گری کا کام کر کے کچھ لا لیتی ہے۔ جاگیر میں نوکر تھا۔ جاگیرات گئے تو اس کے ساتھ نوکری بھی گئی۔ اردو لکھنا پڑھنا آتا ہے۔ لیکن دفتروں سے اردو غائب۔ جہاں دیکھو انگریزی۔ بی بی جی ہم کیا بتائیں۔ مرنا چاہتے ہیں۔ لیکن مرنا بھی میسر نہیں۔ انگریز جانے لگے تو سب نے خوشیاں منائیں کہ اپنا راج ہوگا۔ جنتا راج ہوگا۔ غریبوں کو کھانا کپڑا ملے گا۔ لیکن کیا دیکھتے ہیں۔ الٹا ہی ہو گیا۔ بی بی جی۔ میں نہایت خوش خط ہوں۔ مجھ سے تو لوگ درخواستیں لکھوانے ترستے تھے۔ ایک ایک درخواست کے لئے میں دو دو روپے لیتا تھا۔ آج یہ حال ہے کہ دن بھر رکشا چلانے کے بعد بمشکل ڈھائی تین روپے ہاتھ آتے ہیں۔ رکشا کا مالک گھر بیٹھے سوا روپیہ دھر لیتا ہے۔ رکشا چلاتے چلاتے سینہ خالی ہو گیا ہے۔ بار بار کھانسی آتی ہے۔ بلغم تھوکتا ہوں۔

کرانتی۔ تو تم کوئی دوسری خانگی نوکری کیوں نہیں کر لیتے۔ رکشا چلانا چھوڑ دو۔

رکشا والا۔ بی بی جی بولنا آسان ہے۔ بتاؤ بی بی جی چار جانیں جو میرے ساتھ ہیں ان کا پیٹ کیسے بھروں۔ روپیہ کو سوا سیر چاول۔ اب ڈھائی تین روپے روز بس نہیں ہوتے تھے۔ کون مجھ کو ساٹھ ستر روپے کی نوکری دے گا۔ پھر بیمار ہوئے تو اس دن کی کمائی غائب۔ قرضہ لے کر کھانا پڑتا ہے۔ قرضہ بھی کیسا پٹھانی قرضہ۔ روپیہ کو روز ایک آنہ دو آنے سود۔

اتنے میں کرانتی کا گھر آگیا۔ کرانتی نے رکشا سے اتر کر اپنے ہاتھ کی اٹھنی رکشا والے

کو دیدی۔ اور گھر میں داخل ہوگئی۔

سنہا جی۔ بیٹا کرانتی اتنی دیر کہاں تھی۔ ہم تو آسمان ابر آلود اور بارش کے آثار دیکھکر پریشان ہوگئے کہ تو گھر کیسے آئے گی۔

کرانتی۔ پتاجی میں ریحانہ کے پاس گئی تھی۔ بات میں بات پھر گئی۔ دنیا بھر کی بات نکلی۔ ہندوستان کی تقسیم کا قصہ چھڑ گیا۔ ابوالبہا چچا تے تو وہ باتیں سنائیں کہ میں تو بس حیران رہ گئی۔ پتاجی مجھ کو تو ایسی باتیں صرف ناول کی سی معلوم ہوتی ہے۔

سنہا جی۔ ہاں تو ابوالبہا نے قصہ سنا دیا۔

کرانتی۔ انھوں نے جو کہا وہ تو لمبی داستان ہے لیکن وہ آپ کی بڑی تعریف کر رہے تھے۔ اور کہہ رہے تھے کہ آپ کی بات نہ مان کر ہندوستان کے مسلمانوں نے زبردست نقصان اٹھایا۔

سنہا جی۔ بیٹا میں نے بہت سمجھایا اپنے مسلمان بھائیوں کو کہ مذہب کی بنا پر ہندوستان کی تقسیم ہندو اور مسلمان دونوں کی تباہی کا باعث ہوگی۔ لیکن ہوا کچھ ایسی چل رہی تھی۔ اور خود غرض اس سے استفادہ کر رہے تھے۔ سمجھ کی بات کوئی کرتا ہی نہیں تھا۔ باوجود تقسیم کے اب نہ ہندو چین سے ہیں اور نہ مسلمان چین سے روز کا جھگڑا دن رات کا فساد۔

کرانتی۔ تو کیا پتاجی آپ کی رائے ہے کہ پاکستان اور ہندوستان پھر ایک ملک ہو جائے۔

سنہا جی۔ نہیں بیٹا نہیں۔ جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔ شیشہ ٹوٹ گیا جڑتا نہیں۔ اب تو کم از کم عقل کی بات ہونی چاہیئے۔ یہ بیسویں صدی ہے۔ راجہ مہاراجوں کا

حکومت گئی چرچ کی حکومت گئی۔ مذہب کی بنیاد پر اب کہیں حکومت بن نہیں سکتی۔ دنیا کے کسی ملک میں اب مذہب کی بنیاد پر حکومت نہیں ہے۔ روس نے مذہب کو سرے سے اکھاڑ پھینک دیا ہے۔ اس زمانہ میں مذہب کی بنیاد پر حکومت بنانا پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے۔ خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ستم قاتل۔ جب پاکستان میں مذہب کی بنیاد پر حکومت بن جائے تو جتنے غیر مسلم ہیں وہ سب ذمی اور دست نگر ہو گئے ان کو شہری حقوق نہیں ملے۔ وہ مسلم کے مقابلہ میں برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ دیکھو اس کا اثر ہندوستان پر کیا ہوگا۔ بلا شبہ ہندوستان کی حکومت بالکل غیر مذہبی ہے۔ یہاں بلا لحاظ مذہب وملت نسل و فرقہ سب کو برابر کے حقوق ہیں لیکن نفسیاتی اثرات کو قانون یا دستور کس حد تک زائل کر سکتا ہے۔ ہندو لامحالہ یہ سمجھیں گے کہ ایک طرف تو مسلمانوں نے پاکستان لیا اور ہندوؤں کو ذمی بنا ڈالا دوسری طرف وہ ہندوستان میں بیٹھے برابر کے حقوق پا رہے ہیں۔ ہندوستان کے محب وطن اور قوم پرست کتنا ہی کوشش کریں کہ یہ فضا یہاں پھیلنے نہ پائے۔ لیکن حالات کی رو کو کون روک سکتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر مذہب اسلام کے نام پر خود پاکستان گویا اپنے پانچ کروڑ ہم مذہبوں کے ساتھ غداری کر رہا ہے۔ جن خود غرض لوگوں نے پاکستان کی بنیاد رکھی تھی وہ تو ایک ایک کرکے ختم ہوگئے۔ ڈکٹیٹرشپ نے خود غرض سیاست دانوں کا صفایا کر دیا۔ لیکن یہ کیا بدبختی ہے کہ سیدھا سادہ فوجی پٹھان ابھی اس پیچ سے نہیں نکلا جس میں پاکستان کو خود غرض سیاست دانوں نے پھانس دیا تھا۔

میں مانتا ہوں کہ ہندوستان میں بھی بہت خرابیاں ہیں۔ نقائص ہیں۔ ضرورت سے زیادہ اولوالعزمی دکھائی جا رہی ہے۔ بے دریغ قرضہ لیا جا

چور بازاری بھی ہے۔ فرقہ واریت ہے۔ صوبہ واریت ہے۔ زبان واریت ہے۔
لیکن اس کی بنیاد ایسی زبردست ہے کہ یہ خرابیاں جلد یا بدیر دور ہو جائیں گی یہ
اس کا قانون اس کا دستور ہے۔ دنیا کے کسی ملک میں شاید ہی اتنا عمدہ دستور ملے گا۔

میں یہ بات تم سے اعتقاداً یا خوش فہمی میں نہیں کہہ رہا ہوں۔ دنیا کے
کسی ملک کا دستور اٹھا کر دیکھو انسان کو بہ حیثیت انسان جو عزت دی گئی وہ کسی ملک
کے دستور میں نہیں ملے گی۔ کہیں تو صرف مزدور کلاس کو اونچا کیا گیا ہے۔ کہیں تو نسل کی
بنا پر امتیاز برتا گیا ہے۔ کہیں علانیہ امتیاز کیا گیا ہے۔ کہیں خفیہ طور پر۔ صرف ہندوستان
کا دستور دنیا تمام میں ایسا دستور ہے کہ جس میں صاف الفاظ میں بلا لحاظ مذہب و ملت
نسل و فرقہ عورت و مرد برابر کے حقوق ہر انسان کو دے گئے ہیں۔ دوسری طرف یہاں کا
عدلیہ۔ خواہ اس میں دوسری کچھ خرابیاں ہوں لیکن امور متنازعہ پر فیصلہ دینے میں
حکومت کی بڑی سے بڑی قوت کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ باوجودیکہ ایسے فیصلے بعض وقت
خود حکومت کے لئے اور ملک کے لئے خطرہ بن جاتے ہیں۔

کرانتی۔ یہ تو بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن کیا پتا جی پاکستان اور ہندوستان
میں جو گڑبڑ ہوئی ہے اس کا کوئی حل بھی ہے۔ دیکھو ریحانہ کے ماموں زاد
بھائی پاکستان میں ہیں۔ ادھر ان کی والدہ بیوہ زار و قطار روتی رہتی ہیں۔ برسوں
ملنا نہیں ہوتا۔ آنا جانا مشکل۔ پاکستان سے آتے ہیں تو جانا جی نہیں چاہتا۔ visa
کی مدت ختم ہوئی کہ جانا پڑتا ہے۔ ورنہ چالان ہو جاتا ہے۔ پاکستان میں رہو تو وہاں
نفسی نفسی ہے۔ حیدرآباد کے راہ و رسم میل جول دعوت مدارات وہاں کہاں۔

سنہا جی۔ ہاں بیٹا اب بھی اس کا حل ہے بے شک اب بھی اکثر ہندو مسلمانوں

سے ناراض ہیں۔ لیکن اس کی تاریخی وجوہ ہیں۔ پھر جو گذر گیا وہ گذر گیا۔ وقت کی رفتار
بڑے سے بڑے صدمہ کو دور کر دیتی ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ صدمہ کو تازہ
نہ کیا جائے۔ زخم پر نمک نہ چھڑکا جائے۔ خود غرضوں کے ہاتھ کا کھلونا نہ بنیں۔ مسئلہ
ہے کہ یہاں کی حکومت کو مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ یہاں کا قانون اور دستور
ہے۔ مذہب انفرادی چیز ہے اور ہر شخص اس میں آزاد ہے۔ اس بات کو اچھی طرح
ایمانداری سے ذہن نشین رکھنا چاہئے۔ اجتماعیت نہ پیدا کرنی چاہیئے۔
اس کے معنی یہ نہیں کہ مسجد میں سب مسلمان نماز نہ پڑھیں یا عیدگاہ میں نہ جائیں۔ برابر
مسجد میں نماز پڑھیں اور عیدگاہ میں جائیں۔ لیکن اس نماز پڑھنے میں یا عیدگاہ جانے
میں ایک خاص ذہنیت پیدا کی گئی تھی وہ ذہنیت نہیں ہونی چاہئے۔ یہ بات صرف
احساس کی ہے۔ کہنے کی نہیں ہے۔ اور جو لوگ واقف ہیں اس کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔

دوسری چیز کلچر ہے۔ موٹی موٹی باتیں کہتا ہوں۔ پیتل کا لوٹا چھوڑ کر مٹی کا لوٹا
رکھنا۔ سادہ لوٹا چھوڑ کر ٹونٹی دار لوٹا رکھنا۔ چٹائی چھوڑ کر بوریے پر سونا۔ دھوتی چھوڑ کر
لنگی پہننا۔ لنگیا نام چھوڑ کر عبداللہ نام رکھنا۔ چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں۔ ان چیزوں کے نہ کرنے
سے مسلمانیت جاتی نہیں بلاوجہ اس سے اپنے حقیقی بھائی بہن کی دل آزاری ہوتی ہے
اور تنفر پیدا ہوتا ہے اور بعض وقت یہ چھوٹی چیزیں بڑی ہی بھیانک باتوں کا پیش خیمہ
ہو جاتی ہیں۔ خوشی سے نماز پڑھو، روزہ رکھو۔ لیکن پکیا کے بھائی لنگیا ہی رہو۔ پنجاب
میں ہو تو پنجابی کھانا پینا لباس رکھو۔ مدراس میں ہو تو مدراسی بنے رہو۔ اپنی
ڈیڑھ اینٹ کی مسجد والا معاملہ ٹھیک نہیں۔

ہندوستان کے دستور نے ہر طرح کی آزادی دی ہے۔ جس طرح چاہو رہ سکتے ہو۔

لیکن چار لوگوں میں جینا ہے تو نفسیاتی اُمور کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ اگر اس طرح عمل ہوگا تو تم دیکھو گے کہ ہندو اور مسلمان کے تعلقات میں ایک زبردست کایا پلٹ ہو جائے گی۔ ہندوستان کا نقشہ ہی بدل جائے گا۔

کرانتی۔ لیکن پتاجی۔ اس سے ہندوستان اور پاکستان کا مسئلہ حل نہ ہوگا۔

سنہا جی۔ نہیں بیٹا۔ ایسا نہیں۔ یہ ہندوستان اور پاکستان کا مسئلہ ہی اسی بنا پر کھڑا کیا گیا تھا۔ اور جب تک یہ بنیاد قائم رہے گی یہ مسئلہ اپنی جگہ قائم رہے گا۔ دراصل ہندوستان کی تقسیم چند خود غرض اشخاص کا کھیل تھا۔ مان بھی لو کہ ہندوستان کی تقسیم ہندو اور مسلمانوں میں ہوئی تو یہی کہنا پڑے گا کہ ہندوستان کے ناراض مسلمانوں کو ہندوستان کا ایک حصہ دیدیا گیا یعنی جھگڑا ختم۔ تم اپنی جگہ چین سے رہو۔ ہم اپنی جگہ چین سے۔ اگر پاکستان کی یہ منطق مان لی جائے کہ جس جس حصہ میں مسلمان زیادہ ہوں وہاں رائے عامہ لیجائے اور ان سے پاکستانی ہمدردی جتانے لگیں جیسا کہ وہ کشمیر میں کوشش کر رہے ہیں تو پھر ہندوستان کے پانچ کروڑ مسلمانوں نے کیا قصور کیا ان کو بھی حق ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی رائے ظاہر کریں۔ اس منطق کو اور آگے بڑھایا جائے تو روس کے تمام مسلمان اپنی رائے عامہ ظاہر کرنا چاہیئے کہ وہ روس کی بے دینی حکومت کے تحت رہیں یا پاکستان میں شامل ہو جائیں۔ اسی طرح چین و جاپان کے مسلمانوں کو بھی حق مل جانا چاہیئے۔ صرف ہندوستان میں یہ آفت کیوں آنی چاہیئے۔ وہ بھی صرف کشمیر کے مسلمانوں کی حد تک۔ پاکستان کے سیاست دانوں کے زمانہ میں یہ دھاندلی چلتی تھی تو کچھ بات تھی۔ حیرت کا مقام ہے کہ ایک ڈکٹیٹر کے زمانہ میں جس نے پاکستان کو تمام تعزیرات سے پاک کرنے کا ارادہ کیا ہے ایسی مہمل بات

کہی جائے۔

اس مسئلہ سے جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے حل یہ ہے کہ ہندوستان کے دستور کو مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ مذہب کی بنا پر نہ تو ہندوستانی دستور کسی کی حمایت کرتا ہے نہ مخالفت۔ عیسائی ہوں، پارسی ہوں یا بدھ، ہندو ہوں یا مسلمان مذہب کی بنا پر کوئی اجتماعی تحریک نہیں چلانا چاہیئے۔ مذہب کو بالکل خانگی اپنا ذاتی اور انفرادی معاملہ سمجھنا چاہیئے۔ اپنے کلچر کو محض تبدیل مذہب کی وجہ سے نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ عربی کلچر ہے۔ مصری کلچر ہے۔ انڈونیشیا کا کلچر ہے۔ چینی کلچر ہے۔ جاپان کا کلچر ہے۔ ترکی کلچر ہے۔ مسلم کلچر جس پر ہندوستان میں یا پاکستان میں زور دیا جاتا ہے بذات خود کوئی کلچر نہیں ہے۔

کلچر بھی اپنی جگہ کوئی قائم بالذات چیز نہیں۔ وہ زمانہ کے ساتھ بدلتا رہتا ہے اور بدلنا چاہیئے اور بدلتے ہوئے کلچر کا ساتھ دینا چاہیئے لیکن محض تبدیل مذہب کی بنا پر اپنے کلچر کو خیرباد نہ کرنا چاہیئے بالخصوص اس طرح کہ اس سے دل آزاری ہوتی ہو اور جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے پاکستان کو کبھی یہ نہ کہنا چاہیئے کہ جہاں کہیں مسلمان زیادہ ہوں انھیں حق خود واریت دیا جائے کہ حکومت کو بدل سکیں یہ بڑا خطرناک کھیل ہے اور خود مسلمانوں کے حق میں سنگین نتائج کا حامل ہے۔ اگر پاکستان کے مسلمانوں کو اپنے مسلمان بھائیوں سے مذہب کی بنا پر جو دوسرے ممالک میں ہیں سچی ہمدردی ہے تو کبھی یہ لفظ زبان پر نہیں لانا چاہیئے۔ مذہب کی بنا پر قومیت کا زمانہ تو بالکل نہیں رہا۔ زبان اور نسل بھی قومیت کا معیار نہیں رہے۔ یوں تو محدود قومیت کا زمانہ ہی نہیں رہا۔ دنیا بین قومیت کی طرف جا رہی ہے۔ اگر قومیت ہے تو جغرافیائی

وحدت کی بنا پر پاکستان کے مسلمان ان حالات میں برنائے مذہب قومیت نہیں بنا سکتے۔ چند قومیں اگر اپنے مصالح کی خاطر پاکستان کو اس کھیل کی اجازت دیدیتی ہیں تو بے وقوف نہیں بننا چاہیئے۔ پاکستان کو اگر زندہ رہنا ہے اور ترقی کرنا اور خوددار قوم بننا ہے تو اس کھیل سے باز آنا چاہیئے۔

کرانتی اور سنہا جی میں یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ ان کا بیٹا جگدیش دیوانخانہ میں داخل ہوا۔

جگدیش۔ پتاجی۔ کرانتی کا امتحان ختم ہوگیا اور اب وہ آپ کے ساتھ کچھ نہ کچھ حجت کرتی رہتی ہے۔ کیا حجت ہو رہی ہے پتاجی۔ کرانتی کیا ڈینگیں مار رہی ہے۔ اس نے سائنس کیا پڑھی ہے۔ سب کو بے وقوف سمجھتی ہے۔ دنیا میں بس یہی ایک عقل کی بات کہنے والی نظر آتی ہے اور سب کو بے وقوف سمجھ رکھا ہے۔

کرانتی۔ خاموش جگدیش۔ بس آیا کہ شروع کیں اپنی شیخیاں۔ صبح، شام دوستوں میں آوارہ گردی۔ گھر آئے کہ مجھ کو ڈانٹنا شروع کیا نہ تو کوئی مطالعہ ہے اور نہ کوئی علمی مشغلہ۔ بس تاریخ کیا مضمون لیا ہے کہ اپنے کو مورخ سمجھ بیٹھے۔

جگدیش۔ اچھا بھئی ہم نالائق ہیں اور تم ہی سب سے زیادہ پڑھنے والی اور لائق۔ جی جی۔ میری پیاری جی جی یہ بتاؤ کہ آج تم نے کیا پکایا ہے۔ دیکھو رام نارائن اور قمر آرہے ہیں۔ تو بجے آئیں گے۔ شطرنج جمے گی۔ میری اچھی جی جی آج چائے تمہارے ہاتھ کی پی جائے گی۔

کرانتی۔ بس اور کیا کام ہے دوست اور شطرنج۔ قمر بھیا کو بھی تم نے اس چکر میں پھانسا۔ اس بے چارہ کا امتحان ہے۔ انجینیری میں پاس ہونا کھیل نہیں۔

یہ تاریخ کا امتحان نہیں ہے کہ جو چاہا گپیں لگا دیں۔ آنے دو تا قمر بھیا کی خبر لیتی ہوں کہ یہ کس طرح تمہارے پھندے میں پھنس رہے ہیں۔

جگدیش۔ پھر رام نارائن کا نام کیوں نہیں لیتی۔ اُن کو کیوں نہیں کچھ بولتی۔

کرانتی جگدیش کے اس جملہ پر شرما سی گئی۔ اور کمرہ سے اٹھ کر اندر ماں کے پاس چلی گئی۔

سنہا جی۔ جگدیش تو بہت بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ بڑی بہن سے ایسا مذاق کرتا ہے۔ شرم نہیں آتی۔

جگدیش۔ پتاجی۔ کرانتی جی جی مجھ سے بہت بڑی نہیں ہے۔ پھر بات بات میں مجھ کو ہی ڈانٹتی رہتی ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں۔ سنہا جی اُٹھ کر اپنے کمرہ میں گئے۔ کرانتی اور ماں کے پاس پہنچی جو چوکے میں تھی۔ کرانتی کی ماں سنہ لتا نے کرانتی کو دیکھا تو آگ بگولہ ہوگئیں۔ کہنے لگیں بی بی جی اب باہر سے تشریف لائی ہیں۔ یا تو دن رات ہاتھ میں کتاب یا دوست احباب۔ آخر یہ گھر بار کب ہوگا۔

کرانتی۔ اماں۔ جگدیش کہہ رہا ہے کہ قمر بھیا رات میں نو بجے آرہے ہیں۔ شطرنج ہوگی۔ چاؤ چاہیئے۔

سنہ لتا۔ کیوں۔ قمر کے تو امتحان کا زمانہ ہے۔ وہ کیسا آرہا ہے جگدیش خود خراب سو خواب سب کو خراب کر رہا ہے۔

کرانتی - جگدیش کہہ رہا تھا کہ برج نارائن کے بیٹے بھی آرہے ہیں۔ برج نارائن کے بیٹے رام نارائن سے کرانتی کی بات طے ہوگئی تھی۔ کرانتی کے امتحان کے نتیجہ کا انتظار تھا۔ نتیجہ نکل چکا تھا۔ شادی کا مہورت نکالنا رہ گیا تھا۔

سنہ لتا۔ اچھا تو یہ بات ہے۔ بازو کی دکان سے ایک پاؤ قلاقند منگوا لینا

اب کچھ گھر میں پکانے کا موقع نہیں ہے۔ تھوڑے بسکٹ گھر میں ہیں۔ بس تم چائے بنا لو۔

کرانتی۔ نہیں اماں میں پنیر کے پکوڑیاں بنا لیتی ہوں۔ اس دن پتاجی کو بہت پسند آئے تھے۔ جگدیش نے کہا کہ کچھ میرے ہاتھ کا پکوان ہونا چاہیئے۔ تم بھیا نے اصرار کیا ہے کہ میرے ہاتھ کا بنا ہوا کھائیں گے اور چاء بھی میرے ہاتھ کی پئیں گے۔

سنہہ لتا نے کرانتی کی یہ بات سن کر اپنے آپ مسکرا لیا۔ پھر کرانتی سے مخاطب ہو کر کہا کہ بیٹیا جو تمہارے جی میں آئے کرو۔

۲

رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ سنہا جی کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا سنہہ لتا خود چولھے کے پاس گئیں کہ پہلے سنہا جی کے لئے پھلکے سینکے جائیں۔ سنہا جی چوکے میں چٹائی پر بیٹھ گئے۔ سنہہ لتا ایک ایک پھلکا سینک کر سنہا جی کی تھالی میں ڈالنے لگیں۔ کرانتی نے ساگ کی کٹوریاں پھیکی اش کی دال ایک کٹوری میں سنہا جی کے سامنے رکھ دی۔ اور پھر باپ کے آس پاس گھومتی رہی۔ رام نارائن کے آنے کی خبر ان کو ہو گئی تھی۔ سنہا جی نے کرانتی سے کہا کہ وہ اور جگدیش مینر پر کھانا کھا لیں۔ پھر پکوڑیوں کی تیاری شروع ہو۔ پکوڑیوں میں ہمارا حصہ بھی ہو گا۔ ادھر سنہہ لتا بول اٹھیں کہ ہم کتنی بھی اچھی چیزیں پکائیں مزہ نہیں آتا۔ بس بیٹی کے ہاتھ کا کھانا ہونا چاہیئے۔ کیسا بھی کچا پکا پکائیں۔ تعریف کر کے کھاتے ہیں۔ پھر سنہہ لتا نے خود بین تیار کیا۔ پنیر ملایا۔ چولھا سلگایا اور پکوڑیوں کی تیاری شروع ہوئی۔

رات کے نو بجے رام نارائن اور قمر سنہا جی کے مکان وارد ہوئے۔ دونوں سیکلوں پر تھے۔ قمر کی سیکل کو قندیل نہیں تھی۔ راستہ میں پولیس کے جوان نے پکڑ لیا۔ دونوں تھانے گئے۔ اتفاق سے تھانے پر جگل کشور سب انسپکٹر سنہا جی کے دوست رام کشور مصرا کا بیٹا تھا۔ معاملہ رفع دفع ہوا۔ اور ٹھیک وقت پر رام نارائن اور قمر سنہا جی کے یہاں پہنچ گئے۔ اُدھر جگدیش دیوانخانہ میں بساط بچھائے منتظر بیٹھا تھا۔ قمر کو دیکھتے ہی

سہمہ لتا بہت برہم ہوئیں اور اس کو خوب سنانا چاہتی تھی کہ رام نارائن کی صورت دیکھتے ہی ان کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ دونوں سے کہا۔ آؤ بیٹا آؤ۔ لیکن کرانتی چوکنے والی نہ تھی پہلے تو قمر کو ڈانٹنی بتائی کہ جگدیش کے ساتھ اوقات خراب کرتے ہیں۔ لیکن رام نارائن کو دیکھتے ہی اندر بھاگ گئی۔ بچوں کی یہ گڑبڑ سن کر سہنا جی بھی دیوان خانہ میں آگئے۔ برج نارائن کی خیریت پوچھی۔ قمر کے والد کا حال پوچھا۔ بچے چپ خاموش بیٹھ گئے تو اندازہ دیکھکر اپنے کمرہ میں چلے گئے۔ کرانتی نے جلدی جلدی پکوڑیاں تلا قند اور بسکٹ سلیقہ سے رکابیوں میں جمائے اور خود ہی تھال لے کر دیوانخانہ میں داخل ہوئی۔ ان کے پیچھے کندن چھوکرا چائے کا تھال لیا ہوا آیا۔ قمر کرانتی کو دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا۔

قمر۔ کرانتی جی جی تم نے تکلف کی حد کر دی۔ طرفہ یہ کہ تم ہی سب اٹھا کر لا رہی ہو۔ تمہارا گھر کیا ہے دارالاضیاف ہے۔

کرانتی۔ قمر بھیا یہ دارالاضیاف کیا بلا ہے۔ میں تو کچھ نہیں سمجھی۔

قمر۔ جی جی یہ حیدرآباد کی اردو ہے۔ تم غیر ملکی اس اردو کو کیا سمجھو گی۔ تمہارے پاس تو اردو مر گئی۔ دارالاضیاف گسٹ ہوز کو کہتے ہیں۔ حیدرآباد کے دارالترجمہ کا ترجمہ ہے۔

کرانتی۔ ہم غیر ملکی کیسے۔ ہم بھی تو ایک پشت سے یہاں ہیں اور یہاں بس گئے۔ اب ہم کو کون غیر ملکی کہہ سکتا ہے۔ لیکن یہ اردو تو تم ہی کو مبارک۔ اسی وجہ سے تو اردو کو مسلمانوں کی زبان بولا جا رہا ہے۔ اور مسلمان بھی اس زبان کو اپنی سمجھنے پر فخر کرتے ہیں۔

قمر۔ میں سچ کہتا ہوں جی جی۔ حیدرآباد میں اردو کا وہ ستیاناس مارا گیا

کہ خدا کی پناہ۔ معرب و مفرس کر کے اس کو کہیں کا نہ رکھا۔ سچ مانو ہم لوگ دلی اور لکھنؤ سے آئے۔ لیکن شروع میں ہم تو حیدرآباد کے تعلیم یافتہ ہندوؤں کی اردو کو بھی سمجھنے میں دقت محسوس کرتے تھے۔ قاف اور کاف سے نیچے کی بات ہی نہیں ہوتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی پتھر پھینک رہا ہے۔

کرانتی۔ دیکھو بھیا قمر میں کوئی ادبی آدمی نہیں۔ صرف موٹی موٹی باتیں جانتی ہوں۔ یہ ہماری اردو کیا تھی۔ سیدھی سادھی برج بھاشا۔ بڑی نکیلی سجیلی مغلوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنایا۔ رہ گئے بس گئے۔ شادیاں کریں بیٹی لی بیٹی دی شیر و شکر بن گئے۔ ان کی اپنی زبان فارسی تھی جس میں عربی کے الفاظ ایسے تھے جیسے سونے اور چاندی میں جواہرات جڑ دیے ہیں۔ پھر جو اردو بنی تو کندن اور پچیکاری کا کام ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سونے چاندی میں ہیرے موتی جڑے ہیں۔ رامائن مہابھارت بھگوت گیتا اور اوپنشد کے ترجمے سنسکرت سے فارسی میں ہوئے۔ پھر اردو میں ہوئے۔ امیر خسرو اور عبدالرحیم خانخاناں نے اردو کو سنوارا۔ سرسید اور الطاف حسین حالی نے آرائش کی۔ نذیر احمد نے گلدستے تیار کیے۔ اس زمانہ کی اردو سنو تو معلوم ہوتا تھا کہ پھول جھڑ رہے ہیں۔ جی چاہتا تھا کہ ہمیشہ سنتے رہو۔ اس کے بعد البلاغ اور الہلال کی اردو شروع ہوئی۔ پھر حیدرآباد کی اردو۔

بہر حال اس ہماہمی کا یہ نتیجہ ہوا کہ اردو بیچاری مفرس اور معرب ہوتی گئی اور جتنا مفرس معرب ہوتی گئی اتنا ہی مسلمانوں کی زبان کہلانے لگی اور ہندوستان کے مسلمان بد قسمتی سے اس کو اپنی زبان سمجھنے لگے۔ ادھر پاکستان نے اردو کو اپنی قومی زبان قرار دیا۔

کرانتی۔ ہاں بیٹا اب اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں اردو کو کیا گذر رہی ہے اور گذرے گی۔ سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ یہاں کے کچھ مسلمان بھی اس کو اپنی خاص زبان سمجھ کر اس کی ترویج اور ترقی میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔

اس وقت رات کے ساڑھے دس بج چکے تھے۔ گفتگو اس نوبت پر پہنچی تھی کہ سنہا جی پھر کمرہ میں داخل ہوئے۔ سنہا جی نے سونے کی بہت کوشش کی لیکن کرانتی اور قمر کی زور زور بات چیت سے ان کو نیند نہیں آئی۔ ادھر جگدیش اور رام نارائن شطرنج میں مصروف تھے۔ سنہا جی کمرہ کے اندر داخل ہوتے ہی کہنے لگے کہ بھئی کیا بحثا بحثی ہو رہی ہے۔ اس پر قمر نے پوری گفتگو دہرائی۔ سنہا جی نے سن کر کہا۔

سنہا جی۔ دیکھو بیٹا قمر ہندوستان کی تقسیم سے ہندوؤں کو نقصان پہنچا تو تھا ہی لیکن سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کو پہنچا اور پہنچ رہا ہے۔ اور اردو زبان کو اپنی خاص زبان بول کر انھوں نے اردو کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا۔ سمجھ لو کہ اردو کا دیس نکالا ہو گیا۔

تم اس بات کو مانو گے کہ مفرس اور معرب اردو تو چلنے سے رہی۔ فارسی اور عربی کے الفاظ جو ٹھوسے گئے ہیں وہ تو نکلیں گے ہی۔ لیکن بعض نفسیاتی امور جو کارفرما ہیں اور جو بطور ردعمل کے ہیں، ان کا اثر یہ ہو رہا ہے کہ بہترین جڑاؤ کام بھی غارت ہو رہا ہے۔ مان لو کہ اردو کو پوری طرح نکال باہر پھینکا گیا تو تم کو کیا۔ تمہاری زبان تو اردو نہیں ہے۔ تمہاری زبان تو وہی ہے جس پرونش کے تم متوطن ہو۔ آندھرا میں ہو تو تمہاری زبان تلگو۔ بمبئی میں ہو تو مراہٹی۔ گجرات میں ہو تو گجراتی۔ بنگال میں ہو تو بنگالی۔ جس دیس کی زبان اردو ہے اس پرویس کے باسی اپنی آپ فکر کر لیں گے۔ اردو کی جگہ ہندی لیتی ہے تو

لینے دو۔ تم بلا وجہ کیوں اس کو اپنی زبان سمجھتے ہو۔ اگر اردو میں دم خم ہے۔ جان ہے تو خود جیئے گی۔ ہندوستان کے حالات کے لحاظ سے جس قسم کا لباس پہننا ہے پہنے گی۔ تم دیکھ رہے ہو کہ ایک مخصوص قسم کا لباس پہنانے سے اس کا کیا حشر ہو رہا ہے۔ اس کو تو ایسا لباس پہنانا چاہیئے کہ پنجاب میں سندر دکھے تو راس کماری میں بھی بانکی نظر آئے۔ اور یہ کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ حالاتِ زمانہ اس کا لباس معین کریں گے۔ اس کا فیشن اس کا لباس تیار کرے گا۔

اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔ ادھر رام نارائن اور جگدیش کی شطرنج کی بازی ختم ہوئی۔ اِدھر سنہا جی نے بھی محفل کو برخاست کرنا مناسب سمجھا۔ قمر نے کہا کہ بہت رات ہو گئی ہے مجھے فوراً گھر لوٹ جانا چاہیئے ورنہ آپا خفا ہوں گے۔ رام نارائن اور قمر اپنی اپنی سیکل لے کر گھر روانہ ہوئے۔ سنہا جی اپنے کمرہ میں چلے گئے اور کرانتی نے اپنے کمرہ کا رُخ کیا۔

دوسرے دن صبح کے آٹھ بجے سنہا جی کے بازو کے کمرہ میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی۔ جگدیش نے رسیور اٹھایا۔ مولوی بہاؤ الدین شطاری کے بیٹے ضیاء العارفین کی کال تھی۔

ضیاء العارفین۔ ہلو کون۔ جگدیش۔

جگدیش۔ جی میں جگدیش بول رہا ہوں۔ کہو ضیاء بیٹا۔ کیسے یاد ہوئی۔

ضیاء العارفین۔ جگدیش آج ہمارے یہاں منے کا عقیقہ ہے۔ چچا، چچی، تمہاری اور کرانتی کی ہمارے یہاں دعوت ہے۔ آپ سب لوگ رات میں ہمارے یہاں کھانا کھائیں گے۔

جگدیش۔ تو یوں کیوں نہیں کہتے کہ پورے گھر کی دعوت ہے۔ گویا ہمارے

باورچی خانہ کو قفل لگے گا۔

ضیاء العارفین۔ بس جگدیش تم کو ہر وقت مذاق ہی سوجھتا ہے۔ جاؤ چچا سے پوچھ کر اطلاع دو۔ جگدیش نے سنہا جی کو دعوت کی اطلاع دی۔ اور فوراً دعوت میں آنے کی رضامندی ظاہر کر دی۔

مولوی بہاؤالدین شطاری کا مکان پنجہ شاہ میں تھا۔ قدیم وضع کا مکان۔ مکان کے پہلے دروازہ کے ساتھ ہی دو طرفہ بنک۔ اس بنک کے ایک طرف پچھلے زمانہ میں حبوش کا پہرہ رہتا تھا۔ دوسری طرف روہل کا پہرہ۔ مولوی بہاؤالدین نظم جمعیت میں جمعدار تھے۔ سو روپئی جمعداری جاتی رہی۔ صرف منصب چار سو روپے ماہوار باقی وہ بھی تا قید حیات۔ ان کے بیٹے ضیاء العارفین علی گڑھ کے تعلیم یافتہ ایم اے۔ ایل ایل بی۔ زمانہ طالب علمی سے ہی ان کو سیاسیات میں دخل ہو گیا تھا۔ مسلم لیگ کے زبردست کارکن۔ جب حیدرآباد آئے تو انجمن اتحاد المسلمین سے اپنے کو وابستہ کر لیا۔ بڑے سرگرم کارکن رہے۔ لیکن اس زمانہ کے لیڈروں سے ان کی جمی نہیں۔ اس لئے کچھ دن بعد کنارہ کشی اختیار کر لی۔ مولوی بہاؤالدین شطاری پرانے قسم کے مسلمان۔ نماز کے پابند۔ بے پردگی کے سخت مخالف۔ لیکن سنہا جی اور ان کے خاندان کی حد تک زیادہ سختی نہ تھی۔ سنہا جی کو اپنا بھائی اور ان کے بچوں کو اپنے بچوں کے برابر سمجھتے تھے پھر بیگم بہاؤالدین پردہ کے پیچھے سے ہی سنہا جی سے بات کرتیں۔ کبھی کھلے بندوں سامنے نہیں آئیں۔ البتہ بہاؤالدین کی بیٹی سلمیٰ نہایت بے تکلفی سے سنہا جی کے پاس بیٹھ جاتی۔ بڑی تیز۔ ہنس مکھ خوش مزاج۔ باوجود اس کے ماں باپ کی تعلیم و تربیت کا بہت اچھا اثر تھا۔ کبھی شرم و حیا کو ہاتھ سے جانے نہ دیتی تھی۔ لباس ایسا

پہنتی جس سے پورا جسم ڈھک جائے اور پھر بدسلیقگی نہ معلوم ہو۔ بات کرتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ پھول جھڑ رہے ہیں۔ متانت کو ہاتھ سے جانے نہ دیتی۔ دس برس کی عمر تک قرآن کی باقاعدہ تعلیم دی گئی اس کے بعد سے محبوبیہ گرلز اسکول گئی۔ حافظ قرآن بھی تھی۔ قرآن ایسا پڑھتی کہ اچھے قاری بھی اس کی قرأت پر عش عش کرتے۔ لیکن بہاؤالدین نے بارہ برس سے اس کو باہر پڑھنے سے منع کر دیا تھا۔ سختی سے پردہ کی پابندی کی جاتی تھی۔ سوائے زنانی محفل کے کہیں نہیں جا سکتی تھی۔ یہاں تک کہ خالہ اور چچی کے گھر بھی جانے آنے میں روک ٹوک تھی۔ صرف سنہا جی کے یہاں بلا روک ٹوک جا سکتی تھی۔ سنہا جی اسکو اکثر اپنے پاس بلا کر اس کی قرأت سنتے، خوب جھومتے اور دعائیں دیتے۔

بنک کے سامنے کے دروازہ پر ٹاٹ کا موٹا پردہ پڑا ہوا تھا اس کے بعد مردانی دیوانخانہ۔ سامنے صحن۔ خوب صورت پودوں سے سجایا ہوا۔ کیاریوں میں ایک طرف موتیہ کا تختہ۔ دوسری طرف دیسی گلاب۔ بائیں طرف ایک گوشہ میں چنبیلی کا منڈوا۔ مردانی دیوان خانہ کے سیدھے بازو کی دیوار کوئی اٹھارہ فٹ اونچی۔ دیوار کے اوپر شیشے کے نوکدار ٹکڑے جمے ہوئے۔ اس دیوار میں ایک دروازہ جس پر ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا۔ اس دروازہ کے سامنے، دروازہ کے اونچان کی چھوٹی سی ایک دیوار جس کو پردہ کی دیوار کہتے ہیں۔ اس دیوار سے فائدہ یہ تھا کہ اگر اتفاق سے پردہ اٹھ جائے یا سرک جائے تو بھی مدنظر زنانہ نہیں ہو سکتی۔ اس دیوار کے پیچھے بڑا وسیع صحن جس میں ایک طرف مولسری کا درخت۔ دوسری طرف آم کا درخت۔ صحن میں اطراف کیاریاں بنی ہوئیں۔ کیاریوں میں بھٹ موگرا کا تختہ لگا ہوا۔ صحن کے بیچ میں تخت پڑے ہوئے۔

گرمی کی راتوں میں تختوں پر شطرنجی بچھائی جاتی۔ اس پر سفید چاندنی کے پاٹ۔ اطراف

گاؤ تکیے لگا دیئے جاتے۔ ایک طرف کونے میں پاندان معہ لوازمات کے سلیقہ سے رکھ دیا جاتا۔ یہاں بیگمات کی بیٹھک ہوتی تھی۔

ساڑھے سات بجے شام سنہاجی جگدیش اور کرانتی شطاری صاحب کے مکان پہنچے۔ شطاری صاحب نے بڑے تپاک سے سنہاجی کا خیر مقدم کیا۔ جگدیش کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا۔ جگدیش آداب بجا لایا اور آہستہ سے پیچھے ہو کر ضیاء العارفین سے جا ملا۔ کرانتی باپ کے پیچھے تھی۔ شطاری صاحب نے اس کی طرف سے آنکھ بچاتے ہوئے کہا' جیتی رہو بیٹی جاؤ اندر جاؤ سلمہ تمہارا انتظار رہی ہے۔ شطاری صاحب کے بشرے سے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ایک جوان لڑکی کو اپنے سامنے کھڑا ہوا دیکھ نہیں سکتے۔ جتنی جلدی وہ وہاں سے دفع ہو اچھا ہے۔ کرانتی اندر چلی گئی۔ سنہاجی اور شطاری صاحب مردانی دیوانخانہ میں آ بیٹھے۔ دیوان خانہ کے بازو کے کمرہ میں جگدیش اور ضیاء العارفین ہو گئے۔ ابھی مہمان آنا شروع نہیں ہوئے۔ دعوت آٹھ بجے کی تھی۔ لیکن سنہاجی جلدی پہنچ گئے تھے۔ بہت دن سے شطاری صاحب سے ملے نہ تھے۔ خیال کیا کہ چلو آدھ گھنٹہ پہلے چل کر کچھ گپ شپ لگائیں۔ شطاری صاحب کو انتظامات کرنے تھے۔ دعوت کا موقع۔ زنانی دعوت بھی تھی۔ شطاری صاحب جم کر سنہاجی کے پاس نہ بیٹھ سکے۔ چپکے سے سلمہ کو کہہ دیا کہ سنہاجی کو مصروف رکھو۔ جس کمرہ میں جگدیش اور ضیاء العارفین بیٹھے تھے اس سے متصل ایک اور کمرہ تھا۔ اس کمرہ کا ایک دروازہ ضیاء العارفین کے کمرہ میں کھلتا تھا اور دوسرا دروازہ دیوان خانہ کی طرف۔ اس کمرہ کو ایک تیسرا دروازہ بھی تھا جو زنان خانہ کی طرف کھلتا۔ اس کمرہ کو زیادہ تر سلمہ استعمال کرتی تھی۔ اس کی سہیلیاں اکثر اس کمرہ میں آتیں۔ سلمہ زنانی حصہ سے اس کمرہ میں داخل ہو کر دیوان خانے

دروازہ میں آ گئی اور جھک کر نہایت ادب سے آداب بجا لائی۔ سنہاجی کچھ بولنا ہی چاہتے تھے کہ سلمہ نے کہا۔

سلمہ۔ چچا ادھر تشریف لائیے۔

شطاری صاحب ابھی کچھ کام سے وہاں سے سرکے تھے۔

سنہاجی۔ جیتی رہو۔ اچھا بیٹا۔ ابھی آیا۔

سنہاجی ابھی کمرے میں داخل ہوئے تھے کہ سلمہ کی دو اور سہیلیاں نجمہ اور حمیدہ بھی آ گئیں۔ سنہاجی ایک صوفہ پر بیٹھ گئے۔ سلمہ۔ نجمہ اور حمیدہ بے ہاتھ کی سامنے والی کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ سنہاجی سب کی خیریت خبر پوچھ رہے تھے کہ اندر سے ماما آئی۔ اور کہا کہ سلمہ بی بی کو بیگم صاحبہ بلاتی ہیں۔ سلمہ فوراً اٹھ کر اندر چلی گئی۔

ادھر باہر کے کمرہ سے زور زور کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ضیاء العارفین کی آواز سب میں اونچی تھی۔ اس کے بعد جگدیش کی آواز بھی کم نہ تھی۔ کچھ اور لوگ بھی تھے۔ کچھ تو جگدیش کی تائید کر رہے تھے۔ کچھ ضیاء العارفین کی۔

ضیاء العارفین۔ دیکھو ہمیں کسی دیوانے کتے نے نہیں کاٹا تھا کہ ہم نے بلاوجہ مسلم لیگ بنائی۔ اور پاکستان بنا ڈالا۔ ہم نے بھی انگلش ہسٹری پڑھی تھی۔ پارلیمنٹری سسٹم سے خوب واقف تھے۔ اس پارلیمنٹری سسٹم اور انگلش ڈیماکریسی نے ہمیں سکھلایا کہ ہم مسلم لیگ بنائیں۔ اور اپنے لئے علحدہ ہوم لینڈ طلب کریں۔ مانا کہ کانگریس ایسی جماعت تھی۔ جس میں ذات پات اور مذہب کی بنا پر کوئی فرق نہیں تھا۔ لیکن [illegible] درج ہونا اور چیز ہے اور اس پر عمل دوسری چیز۔ بتیس کروڑ ہندو ایک طرف اور دس کروڑ مسلمان دوسری طرف۔ پارلیمنٹری ڈیماکریسی میں ہمیشہ مجارٹی

کی بات چلتی ہے۔ حکومت میں ہندوؤں کی مجارٹی۔ کانگریس میں ہندوؤں کی مجارٹی۔ اس طرح ہم ہمیشہ مینارٹی میں رہے۔ کانگریس خود ہم کو مینارٹی سمجھتی رہی۔ مینارٹی ہمیشہ مجارٹی کے رحم و کرم پر۔ ملک کی آزادی کے لئے ہم نے کچھ کم قربانیاں نہیں دیں۔ بلکہ سچ پوچھو تو ہم نے وہ قربانیاں دی ہیں کہ تاریخ میں یادگار رہیں گی۔ ان سب کے باوجود ہم مینارٹی کے مینارٹی ہی رہے۔ کانگریس جیسے آرگنیزیشن میں ہم کو مینارٹی سمجھا جائے اور مینارٹی بھی ایسی مینارٹی جو کبھی مجارٹی ہو نہیں سکتی تو کس طرح ہم اپنے کو متحدہ ہندوستان میں برابر کا شہری اور برابر کے حقوق والا سمجھ سکتے تھے۔ چاہے ہم کو ہندوؤں سے زیادہ حقوق دیئے جائیں۔ ہر جگہ ہم کو تفوق دیا جائے۔ حکومت میں بڑے بڑے عہدے دیئے جائیں۔ لیکن یہ سب کچھ مجارٹی کی فراغ دلی اور رحم و کرم پر ہوگا۔ بطور استحقاق نہیں۔ یہ تو بالکل بے عزتی کی زندگی ہوئی۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں اور ہم کو کچھ نہ ملے لیکن استحقاق برابر کا ہو۔ غریبی اور مفلسی کی زندگی بہتر ہے بے عزتی اور تول کی زندگی پر۔ آخر کانگریس یہ فراغ دلی کب تک نبھاتی رہے گی۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے حقوق و مراعات دیئے جائیں۔ اس سے زیادہ کانگریس اور کیا کر سکتی ہے۔ لیکن میں اس کا قائل نہیں ہوں اگر ہم دائمی اقلیت کی بنا پر مستحق نہیں ہیں تو ہم کو کوئی چیز نہیں ملنا چاہیئے اور اگر قابلیت کی بنا پر مستحق ہیں تو پھر تناسب کا کوئی سوال پیدا نہیں ہونا چاہیئے۔ اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ موقع پرست بیجا فائدہ اٹھا رہے ہیں جس سے درحقیقت ملک کا نقصان ہے۔ خواہ ہندوستان کا ہو یا پاکستان کا۔ اس وجہ سے ہم کو پاکستان بنانا پڑا۔

جگدیش۔ ضیاء میں مانتا ہوں کہ تم نے جو کچھ کہا بڑی حد تک صحیح ہے۔ لیکن

تمہارے استدلال کی بنیاد ہی غلط ہے۔ مسلمان جب تک اپنے آپ کو مذہب کی بنیاد پر ایک علحدہ قوم سمجھتا رہے گا۔ اس کو ان تمام امور کا سامنا کرنا پڑے گا جو تم نے بیان کئے ہیں۔ اس سے دنیا کے کسی خطہ میں بھی تم کو گریز نہیں ہو سکتا کیا تم چین و جاپان میں اپنے آپ کو علحدہ مسلمان قوم سمجھ سکتے ہو۔ کیا روس میں تمہاری یہ پوزیشن ہے یہاں تک کہ عربستان اور مصر میں بھی جہاں مسلمان ہی مسلمان ہیں وہاں کے لوگ ایسا دعویٰ کرنا پسند نہیں کرتے پھر اس بیسویں صدی کے ختم پر ایسا خیال کس حد تک سود مند ہو سکتا ہے۔

ضیاء العارفین۔ ہم ہندوستان میں ایسا کرنے پر مجبور تھے۔ خود انگریزوں کے زمانہ میں ہندو اور مسلمان دو الگ قوم ہو چکے تھے۔ ہر جگہ مذہب کی بنیاد پر فسادات ہونے لگے تھے۔

اُدھر مہمان جمع ہو گئے راستے کے ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ دسترخوان چن دیا گیا بہاؤالدین شکاری نے سب مہمانوں سے مخاطب ہو کر دسترخوان کی طرف چلنے کی درخواست کی۔ مہمان یکے بعد دیگرے آفتابہ میں ہاتھ دھونے کے بعد دسترخوان کے اطراف بیٹھنے لگے۔ کوئی بیس آدمی کا دسترخوان تھا۔ تقریباً سب مسلم لیگی ٹائپ کے لوگ تھے۔ کسی کسی کے سر پر استرخانی چمڑے کی ٹوپی تو اکثر کے سروں پر مصری ٹوپیاں تھیں۔ سہنا جی صرف ایک ہندو اس محفل میں تھے۔ سفید شیروانی اور سفید چوڑی دار پائجامہ پہنے ہوئے ننگے سر سہنا جی پھلکے اور ترکاری کھاتے تھے۔ عرصہ سے انھوں نے گوشت کھانا چھوڑ دیا تھا۔ بیگم بہاؤالدین نے خاص اپنے ہاتھ سے پھلکے سینک کر سہنا جی کے لئے بھیجنا شروع کئے۔ کھانا شروع ہوا۔ سہنا جی دس منٹ میں کھانے سے فارغ ہو کر بیٹھ گئے۔ اور پندرہ منٹ کے بعد کھانا ختم ہونے کو

ہی تھا میٹھا شروع ہو رہا تھا کہ مہمانوں میں سے ایک مہمان ابو ظفر یحییٰ نے مسلمانوں کی زبوں حالی کا ذکر چھیڑا۔ کہنے لگے کہ اب مسلمانوں کو ایک ایسا پلیٹ فارم بنانا چاہیئے جس پر سب مسلمان متحد ہو کر اپنے حقوق کی حفاظت کی کوشش کریں۔ کہنے لگے سنہا جی سے تو کوئی راز نہیں ہے۔ وہ ہمارے دکھ درد کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں دیانتداری سے کہتے ہیں۔ خواہ وہ کتنا ہی درشت لہجہ میں کہیں ہم کو برا نہیں معلوم ہوتا۔ پولس ایکشن سے پہلے تو ہم نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ہم حیدرآباد میں بلا تک چک سنہا جی کو دینے تیار ہیں۔ وہ چاہے جیسی حکومت بنائیں ہم کو کوئی اعتراض نہیں۔ بہرحال جب کہ اقوام درج فہرست۔ دیگر پس ماندہ اقوام اور اسی طرح کے چھوٹے چھوٹے فرقہ مینارٹی اور پسماندگی کی بنا پر اپنے حقوق کا تحفظ کرا رہی ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان غافل بیٹھے رہیں۔ مسلم اوقاف کے مسائل ہیں۔ اردو داں مسلمان ملازمین کا مسئلہ ہے۔ مساجد اور قبور کی حرمت کا سوال ہے۔ جب تک کہ اس طرح کا ایک پلیٹ فارم نہ بنایا جائے ہمارے مسائل حل نہیں ہو سکتے۔

حاضرین نے ٹھیک ہے ٹھیک ہے کہا۔ بہاؤالدین شطاری نے کہا کہ ہم کو سنہا جی کے خیالات بھی معلوم ہونے چاہئیں جب ہم اپنے یہاں شادی بیاہ کے معاملے میں آپسی تعلقات کے بارے میں ان سے مشورہ اور مدد لیتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس معاملہ میں بھی ان سے رائے اور مدد نہ لیں۔ مذہبی معاملوں میں بھی ان کے معلومات ہم سے کچھ کم نہیں ہیں۔ ابو ظفر نے بھی اٹھ کر سنہا جی سے درخواست کی کہ وہ رہنمائی فرمائیں۔ سنہا جی کچھ دیر تامل کے بعد کہنے لگے۔

سنہا جی۔ دیکھو بھائیو برا نہ ماننا۔ میں اکثر اوقات ذرا سخت لہجہ میں کہہ دیتا ہوں۔ یہ میری گستاخی ہے لیکن میں کیا کروں۔

ع کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ

مدراس میں مسلمان کا سوال نہیں۔ آندھرا میں مسلمان کا مسئلہ نہیں۔ بمبئی میں مسلمان کا خاص مسئلہ نہیں۔ اگر یہ سوال تھا تو سب سے زیادہ حیدرآباد اور یو۔پی میں تھا۔ یہ کیوں۔ یہ مسلمان مسلمان کا مسئلہ آپ جیسے نئے تعلیم یافتہ حضرات نے پیدا کیا ہے۔ حیدرآباد میں پولس ایکشن سے پہلے کی حکومت کو مسلمانوں کی حکومت کا نام دیا گیا۔ حالانکہ حیدرآباد میں مسلمانوں کی حکومت تھی ہی نہیں۔ راج شاہی تھی نظام خود مختار تھے مگر انگریزوں کی شہنشاہیت تھی۔ انگریز جیسا کہتے کرتے تھے۔ انگریزوں نے ذرا ڈوری ڈھیلی کی تو خود مختاریت کا نعرہ لگایا۔ ڈوری کھینچ لی تو سب خاموش۔ اصل میں حیدرآباد کی حکومت چند خاندانوں کے ہاتھوں میں تھی۔ یہ خاندان بڑے فریس اور مدبر تھے۔ انگریزوں کی پالیسی پر نظر رکھ کر حکومت کرتے تھے۔ بہتے کلیدی عہدے سب ان خاندانوں کے افراد میں بٹے ہوئے تھے۔ اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے خیال سے عثمانیہ یونیورسٹی کھولی گئی۔ دارالترجمہ قائم ہوا۔ دارالترجمہ کیا تھا۔ روپیہ بنانے کی مشین۔ اس یونیورسٹی سے بہت بڑا فائدہ یہ ہوا کہ حیدرآباد کے غریب لوگ جن کو اعلیٰ تعلیم نصیب نہ تھی۔ اعلیٰ تعلیم پانے لگے۔ اعلیٰ تعلیم نے حیدرآبادیوں میں ہیجان پیدا کر دیا۔ ہندو بھی کافی تعداد میں اس یونیورسٹی میں شریک ہوئے لیکن زیادہ تر غریب مسلمان اس سے مستفید ہوئے۔ ملک میں ہیجان پیدا کرنے میں زیادہ حصہ لینے لگے۔ اُدھر یوروپی تعلیمی وظائف ملنے لگے۔ چند کو نوکریاں مل گئیں۔ بہت سے بیکار رہے۔ ہندوستان میں کانگریس نے دیسی ریاستوں میں ذمہ دارانہ حکومت کی تحریک شروع کی۔ حیدرآباد مسلم لیگیوں کی پشت پناہی

بننے لگا۔ ہندو مہاسبھا اور راشٹر سیوا سنگھ کا زور شروع ہوا۔ آریہ سماجی تحریک نے زور پکڑا۔ بیچارے ہندو اور مسلمان اس ہماہمی میں آ گئے۔ اصل میں حیدرآباد میں مسلمانوں کی حکومت تھی ہی نہیں۔ راج شاہی تھی۔ چند خاندان حکومت پر حاوی تھے۔ اتفاق سے یہ خاندان مسلمان تھے۔ اور بس۔ اُدھر ہندوستان کی تقسیم ہوئی۔ پاکستان بنا۔ جو مسلمان پاکستان میں رہے اور جو پاکستان میں چلے گئے سو چلے گئے۔ باقی مسلمان اور وہ بھی تقریباً دس کروڑ ان پر کیا گزرے گی۔ پاکستان نے ان کی پروا نہ کی۔

تقسیم ہند سے قبل حیدرآباد میں جو تحریکات چلی تھیں اُن کا ردِ عمل تقسیم ہند کے بعد حیدرآباد میں شروع ہوا۔ اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ وہ تو غنیمت سمجھو کہ سمجھدار لوگوں کے ہاتھوں میں ہندوستان کی حکومت تھی۔ حیدرآباد بال بال بچ گیا۔ بڑی صلاحیت سے اس گتھی کو سلجھایا گیا۔ ورنہ اتاترک کا جو نعرہ لگایا گیا تھا وہ حیدرآباد کے مسلمانوں کو ختم کر دیتا۔ خیر جو ہوا سو ہوا جو قدرت کو منظور تھا ہوا۔ حکومت بھی ایک حد تک رعایا کی مدد کر سکتی ہے۔ رائے عامہ کے خلاف جانے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اب مذہب کی بنا پر حقوق کا مطالبہ اپنے آپ کو قعرِ ذلت میں ڈالنے کے برابر ہے۔ خواہ مسلمان ہوں یا عیسائی پارسی ہوں یا سکھ، بدھ ہوں یا جین۔ اجتماعی زندگی میں ہم سب صرف ہندی ہیں اور کچھ نہیں۔ گھر میں تم چاہے تو پوجا کرو چاہے نماز پڑھو چاہے چرچ کو جاؤ یا مسجد کو چاہے خدا کو نہ مانو چاہے دس ہزار خدا مانو۔ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد والا معاملہ چھوڑ دو۔ تم نے بحیثیت سچے دوست اور ہمدرد کے میری رائے پوچھی اور میں بحیثیت آپ کے بہی خواہ کے یہ رائے عرض کر رہا ہوں۔ چاہے مانو چاہے نہ مانو۔ قانون اور دستور کے لحاظ سے تم کو اس کی آزادی ہے کہ جو سنگٹھن اور مانگ کرنا چاہتے ہو کرو۔ لیکن انسان صرف قانون

دستور اور منطق پر جی نہیں سکتا اس کو نفسیاتی امور کا لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ اگر آپ کو ہندوستان میں رہنا اور جینا ہے تو اجتماعی زندگی میں آپ کو صرف ہندی میں ہی رہنا پڑے گا۔

مقتدر رجوحال ہی میں پاکستان سے آیا تھا اور جو ضیاء العارفین کے بازو بیٹھا تھا آہستہ سے ضیاء العارفین کے کان میں کہا کہ بڑھاوہی اپنی پرانی منطق چلا رہا ہے۔ ضیاء العارفین نے چپکے سے اس کے چٹکھالی۔

اس عرصہ میں مہمان دسترخوان سے ایک ایک کر کے اٹھنے لگے۔ پان کی تواضع ہوئی۔ کرانتی بھی زنانہ سے باہر آئی۔ سب سے آخر میں سہنا جی جگدیش اور کرانتی گھر سدھارے۔

۳

قمر کے امتحان کا نتیجہ نکلا۔ درجہ اول میں انجینیرنگ کی ڈگری لی۔ پیامات آنا شروع ہوئے۔ نواب بدرالدین خاں جاگیردار نے اپنی بیٹی کا پیغام بھیجا۔ لڑکی صورت شکل کی اچھی۔ ایک لاکھ روپیہ اس کے نام اس کی ماں نے جمع کر دیا تھا۔ گانا اچھا جانتی تھی۔ ابوالبہا افتخارالدین کے خلیرے بھائی مصباح الدین دفتر معتمدی تعمیرات میں منتظم تھے۔ حال ہی میں ان کا انتقال ہوا تھا۔ ان کی لڑکی رشیدہ نے ابھی انگلش لٹریچر میں بی اے کیا تھا۔ غریب لوگ تھے لیکن نہایت شریف۔

رشیدہ ہمیشہ سوتی لباس پہنتی۔ کسی نے اس کو ریشمی لباس میں نہیں دیکھا اور وہ بھی صوفیانی۔ خود گھر کا کھانا پکاتی۔ اُن کے گھر میں ماما رکھنا عیب سمجھا جاتا تھا۔ رنگ زیادہ کھلا نہیں تھا۔ لیکن صحت اچھی تھی۔ سن کوئی انیس ۱۹ سال کا ہوگا۔ قمر کے لئے پیامات کا تانتا بندھ گیا۔ ابوالبہا اور ان کی بیگم نے یہ طے کیا کہ سنہا جی سے مشورہ کریں۔ بیگم نے کہا کہ ہمارے بزرگ اور سرپرست وہی ہیں۔ ان سے بہتر کس کی رائے ہو سکتی ہے۔ اُسی دن شام کو سنہا جی کے گھر جانے کی ٹھیری۔ چنانچہ ابوالبہا اور ان کی بیگم شام کے ساڑھے چھ بجے اچانک سنہا جی کے مکان پر پہنچے۔ سنہا جی اور سنہہ لتا ان کو دیکھ کر حیران ہو گئے۔

سنہا جی۔ کہو کیا بات ہے آج آپ ایسے اچانک آ گئے۔ خیر تو ہے۔ سنہہ لتا بیگم ابوالبہا کو اندر لے گئیں۔

ابوالبہا۔ نہیں کوئی بات نہیں ویسے گھر میں بیٹھے جی اچاٹ ہو رہا تھا۔ خیال کیا چلو آپ سے مل لیں۔

سنہا جی۔ قمر کی کامیابی مبارک ہو۔ میں کہتا نہ تھا وہ ضرور فرسٹ کلاس حاصل کرے گا۔ بڑا ذہین اور محنتی لڑکا ہے۔ کرانتی جو اپنے کمرہ میں تھی یہ گڑبڑ سن کر باہر آئی۔ کہنے لگی میں کہتی نہ تھی قمر بھیا ضرور فرسٹ کلاس حاصل کریں گے۔ خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی۔ سنہہ لتا نے بھی کہا کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ قمر سے یہی امید تھی۔ اب دیکھو جگدیش صاحب کیا کرتے ہیں۔ بیگم ابوالبہا نے قمر کے لئے پیامات آنے کا ذکر کیا۔

بیگم ابوالبہا۔ بہن اتنے پیامات آ رہے ہیں کہ کہا نہیں جاتا۔ سمجھ میں نہیں آتا کس کو ہاں کہیں اور کس کو نہ۔

کرانتی۔ ہم جائیں گے۔ دیکھیں گے۔ دعوتیں کھائیں گے پھر جو پسند آئے گی تو ہاں کہیں گے۔

سنہا جی۔ آخر قمر کی رائے بھی تو لینی ہوگی۔ شادی اس کی ہو رہی ہے۔ کیا کرانتی ہی اس کا ٹھیکہ لیے بیٹھی ہے۔

کرانتی۔ جی پتا جی۔ میں جو پسند کروں گی قمر بھیا اسی کو ہاں کہیں گے۔ اتنے میں جگدیش اور قمر آ پہنچے۔

جگدیش۔ کرانتی جی جی اب ہم تاج محل سے آ رہے ہیں۔ قمر نے زوردار پارٹی دی تھی۔ بڑا مزا آیا۔ سنتی ہو قمر کو جمشید پور سے چار سو روپے ماہوار کا آفر آیا ہے

کرانتی۔ اچھا تو ہم کو چھوڑ کر قمر بھیا نے پارٹی دی۔ کیوں قمر بھیا ابھی سے

یہ حال ہے۔

قمر۔ کرانتی جی جی۔ نہیں ایسا نہیں۔ بھلا آپ کو چھوڑ کر کوئی پارٹی ہو سکتی ہے۔ بات اتنی تھی کہ کالج کے ساتھیوں نے تنگ کیا کہ آج کچھ کھلایا پلایا جائے۔ سب مجھ کو زبردستی تاج محل پکڑ لے گئے۔ مجبوراً سب کی چاء پانی سے تواضع کی گئی۔ یہ جگدیش صاحب بھی راستہ میں گھس گئے۔

کرانتی۔ اچھا قمر بھیا اس وقت چچا اور چچی آئے ہوئے ہیں۔ کہہ رہے ہیں کہ تمہاری شادی کر بہت سے پیامات آئے ہیں۔ کس کو ہاں کیا جائے۔

قمر۔ اس میں مجھے کیا کہنا ہے۔ آپ لوگ جو طے کریں گے مجھے منظور ہے۔

کرانتی۔ اجی جناب وہ نواب بدرالدین خاں صاحب کی بیٹی ہے نا۔ اس کے نام ایک لاکھ روپیہ جمع ہے۔ دوسرے اور اعلیٰ عہدہ داروں کی بیٹیوں کے بھی پیامات آئے ہیں۔ اب آپ کیا فرماتے ہیں۔

قمر۔ دیکھو کرانتی جی جی۔ میں روپے سے شادی نہیں کرتا۔ آپ تو میری طبیعت سے واقف ہیں۔ اور نہ بڑے کروفر عہدہ داریت کو پسند کرتا ہوں۔ شادی لڑکے اور لڑکی کی ہوتی ہے۔ روپے کی نہیں۔ عہدہ داریت کی نہیں۔ پھر شادی صرف لڑکے اور لڑکی کی ہی نہیں ہوتی بلکہ ایک خاندان کی دوسرے خاندان کیساتھ وابستگی ہوتی ہے۔ لڑکی ایسی ہونی چاہیئے کہ جس خاندان میں جائے اس خاندان کے ہر فرد کو اپنا سمجھے۔ مطلب یہ ہے کہ اس گھر میں کھپ جائے۔ یہ نہیں کہ آج شادی ہوئی اور گھر الگ۔ اچھا کرانتی جی جی وہ ہمارے چچا صباح الدین تھے۔ ان کی لڑکی رشیدہ ہے۔ ان کی طرف سے بھی کوئی پیام آیا۔

کرانتی۔ قمر بھیا بس تم نے میرے منہ کی بات لے لی۔ رشیدہ کا پیام آنکا

چچا نے کوئی تذکرہ تو نہیں کیا۔ بیچارے غریب ٹھیرے۔ مصباح الدین کا انتقال ہو گیا۔ ان کی والدہ کیا ہمت کرتیں کہ آپ کے گھر پیام بھیجتیں لیکن قمر بھیا میں کہوں گی کہ رشیدہ ہیرا ہے۔ بس لاکھوں میں ایک ایسی ہوتی ہے۔ گو رنگ بہت صاف نہیں ہے لیکن گنوں میں گنوتی۔ تمہارے لئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے جوڑا بنایا ہے۔ اچھا اندر چلو چچی وغیرہ سب لوگ ہیں۔

سنہہ لتا۔ اوہو قمر تم آگئے۔ تمہاری بڑی حیات ہے۔ بیٹھو اوہر بیٹھو۔ دیکھو تمہارے والد اور والدہ بھی تشریف لائے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ تمہارے لئے بہت پیامات آرہے ہیں۔ اب تم شادی کے قابل ہو۔ پڑھائی مکمل کر لی ہے۔ سنا ہے کہ تمہیں اچھی نوکری بھی ملنے والی ہے۔ ماں باپ کو اس سے زیادہ اب کیا خوشی ہوگی کہ تمہارے سہرے کے پھول دیکھیں۔ کہو کیا ارادہ ہے۔

قمر۔ چچی ماں میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔ آپ لوگ جو طے کریں۔

سنہہ لتا۔ اجی وہ نواب بدرالدین خاں جاگیردار کی بیٹی ہے نا۔ ناک نقشہ کی اچھی۔ پھر ایک لاکھ روپے اس کے نام جمع ہیں۔ تم آسانی سے امریکہ جا کر بڑی ڈگری لا سکتے ہو۔ تم دونوں شادی ہونے کے بعد امریکہ جا سکتے ہو۔ پھر نواب صاحب اب بھی گھر کے اچھے ہیں۔ ۱۹۷۰ء تک تو کمپنسیشن ملے گا۔ اپنے بھائیوں کا حصہ غصب کر کے کافی جائداد بنالی ہے۔ کم از کم مکانات کا کرایہ ماہانہ دو ہزار روپے آتا ہے۔ زر و جواہر علحدہ۔ پھر لڑکی گانا جانتی ہے۔ میٹرک تک تعلیم پائی۔ بھئی میرا خیال تو یہ ہے کہ ایسے موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیئے۔

کرانتی۔ تائی جی آپ یہ کیا فرما رہی ہیں۔ کیا روپے کی خاطر قمر بھیا کو بیچ دیں گے

معاف کرنا ماما جی ہم آپ کے سامنے بچے ہیں۔ لیکن جاگیرداری والا معاملہ ہم کو پسند نہیں۔ پھر قمر بھیا کو دیکھو ان کے گھر کو دیکھو۔ قمر بھیا کے گھر سے ان کے گھر کو کیا نسبت۔ آج شادی ہو گی کل قمر بھیا امریکہ جائیں گے۔ اور امریکہ سے واپسی پر جاگیردار صاحب کے گھر براجمان ہوں گے۔ یہ بوڑھے چچا جی ایڑیاں رگڑتے رہیں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ خود قمر بھیا اس پیام کو پسند نہیں کرتے۔ آپ لوگوں کی نظر رشیدہ پر کیوں نہیں پڑتی۔ کیا اس وجہ سے کہ وہ لوگ غریب ہیں۔ خوبصورت نہیں ہے۔ پھر یہ لوگ قمر بھیا کے قرابت دار بھی۔

سنہہ لتا۔ ہاں ٹھیک تو ہے۔ میری کرانتی بھی بعض وقت دل کو لگنے والی بات بول دیتی ہے۔ سہنا جی کی طرف دیکھ کر آپ کی کیا رائے ہے۔ ابوالبہا اور ان کی بیگم نے کہا کہ اُدھر سے کوئی پیام تو آیا نہیں۔

کرانتی۔ بے چارے پیام بھیجنے کی کیا ہمت کرتے۔ مصباح الدین صاحب کا تو انتقال ہو گیا۔ ضعیفہ ماں ہے۔ قمر بھیا کا ارادہ اُدھر ہے۔ اور میری رائے میں قمر بھیا کے لئے اس سے بہتر جوڑا نہیں ہو سکتا۔ آپ لوگ کوئی فکر نہ کریں میں سب ٹھیک کئے دیتی ہوں۔

کرانتی کی باتوں سے سب کے چہروں پر مسترت کی لہر دوڑ گئی۔ قمر تو پھولے نہیں سما رہا تھا۔ چاہتا تھا کہ کرانتی کے قدموں پر گر کر اس کے قدم چوم لے۔ کرانتی نے قمر کے دل کی بات جان لی۔ رشیدہ کو اُس نے کالج آتے جاتے اکثر دیکھا تھا۔ ہمیشہ سادہ لباس۔ کبھی نظر اونچی نہیں۔ سیدھا کالج کو بس میں جاتی اور سیدھا پھر بس میں چلی آتی۔ رشیدہ کے چہرہ پر ہمیشہ متانت رہتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ صبر و تحمل کی دیوی ہے۔ اس گفتگو کے تین دن بعد کرانتی سیدھا رشیدہ کے گھر پہنچی۔ رشیدہ سے کرانتی کی زیادہ ملاقات تو نہ تھی۔

لیکن کالج میں اکثر ایک دوسرے کو دیکھا کرتے تھے۔ ملنا جلنا نہیں تھا۔ کرانتی سیدھا رشیدہ کی ماں رحیم النسا کے پاس پہنچی۔ رشیدہ کو خواہی نخواہی کرانتی کا ساتھ دینا پڑا۔ اپنی ماں سے کرانتی کا تعارف کرایا کہ یہ سہنا جی کی بڑی بیٹی ہیں۔ بی۔ ایس۔ سی۔ کا امتحان دیا ہے۔

رحیم النسا۔ اچھا تو بیٹا تم سہنا جی کی بیٹی ہو۔ ہم نے سہنا جی کا نام سنا ہے۔ وہ تو انسان نہیں فرشتہ ہیں۔ ایسے لوگ دنیا میں کم ہوتے ہیں۔ ہاں تو تم نے بھی بڑی بڑی ڈگریاں لی ہیں۔ آخر تم لوگ یہ ڈگریاں لے کر کیا کرو گے۔ آج کل چھوکرے تو پڑھنے سے گریز کرتے ہیں اور تم لڑکیاں بی۔ اے۔ یم۔ اے ہوتی جاؤ۔ رشیدہ کو دیکھو۔ بی اے پاس کیا۔ ابھی اور کیا کیا کرنا چاہتی ہے۔

کرانتی۔ جی۔ میں آپ کے پاس ایک گزارش لیکر آئی تھی۔ اجازت ہو تو عرض کروں۔

رحیم النسا۔ ہاں کہو بیٹا کہو کیا کہنا ہے۔

کرانتی۔ جی عرض ہے کہ مولوی ابوالبہا افتخار الدین کے صاحبزادے قمر الدین ہیں نا۔ انھوں نے اس سال انجینرنگ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ اور جمشید پور میں چار سو روپے ماہوار کے نوکر بھی ہو گئے۔ ان کے خاندان سے ہمارے خاندان کے برادرانہ تعلقات ہیں۔ یوں سمجھو کہ قمر الدین میرے بھائی ہیں۔ رشیدہ کے لئے میں ان کا پیغام لائی ہوں۔

رحیم النسا۔ تھوڑی دیر تو خاموش رہیں۔ پھر کہا کہ بیٹا وہ بڑے لوگ ہیں ہم غریب۔ میں بیوہ۔ ہماری ان سے کیا نسبت۔ ہاں میں نے بھی سنا ہے کہ لڑکا بہت شریف ہے اور خاندان بھی اچھا ہے۔ پر ان کے پاس تو بڑے بڑے گھروں کے پیامات

آئیں گے۔ ہم کس گنتی میں۔ چھوٹا منہ بڑی بات۔

کرانتی ۔ نہیں آپ ایسا نہ فرمایئے۔ بڑا اچھا خاندان ہے اور بڑے اچھے لوگ۔ اگر آپ کا منشا ظاہر ہو تو میرے پتا جی خود آپ کے پاس حاضر ہوں گے کیوں کہ قمر کو وہ اپنی اولاد کے برابر سمجھتے ہیں۔

رحیم النسا ۔ سنہا جی میرے گھر آئیں۔ زہے قسمت۔ ہاں بیٹا تم ذرا رشیدہ سے بھی دریافت کر لو۔

رشیدہ پہلے سے قمر کا نام سن چکی تھی کالج میں اس کی شہرت تھی۔ مانا ہوا سنجیدہ اور حلیم الطبع لڑکا تھا۔ رشیدہ اور قمر کی ایک دو مرتبہ چار آنکھیں بھی ہوئی تھیں۔ کرانتی سیدھا رشیدہ کے کمرہ میں پہنچ گئی۔ رشیدہ نے کرانتی کو کئی بار دیکھا تھا۔ لیکن خاص تعارف نہیں ہوا تھا۔ پر کرانتی کالج میں بہت سوشیل تھی۔ اس طرح نہ جاننے والے بھی اس کو جانتے تھے۔ رشیدہ سے کرانتی نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں یہ پیام لائی ہوں۔ میں تو صرف نامہ بر ہوں لیکن میرے پتا جی اور ماتا جی نے مجھے نامہ بر بنایا ہے۔ قمر جیسا لڑکا۔ سنہا جی اور سنہا تا کا جل اور کرانتی جیسی نامہ بر۔ رشیدہ نے اپنا سر نیچا کر لیا۔

اگلے مہینے کی بیس تاریخ کو شادی ٹھہر گئی۔ رحیم النسا کو پچھتر روپے ماہوار وظیفہ ملتا تھا۔ اسی میں گھر چلتا تھا۔ سنہا جی کو اس کی خبر ہوئی۔ ایک پالیسی جو سنہا جی نے کرانتی کے لئے لے رکھی تھی ابھی پک چکی تھی۔ دو ہزار روپے ملے تھے۔ یہ دو ہزار روپے سنہا جی نے کرانتی کے حوالہ کئے کہ رشیدہ کی شادی کا انتظام کرے۔ لیکن اس طرح کرنا کہ رحیم النسا کو یہ نہ معلوم ہونے پائے کہ ہم نے کوئی احسان کیا ہے۔ رشیدہ اور قمر کی شادی ۲۰ مئی کو ہو گئی اور آٹھ روز بعد دونوں جمشید پور سدھارے۔

---

(۴)

برج نارائن کے یہاں سے تقاضا شروع ہوا کہ شادی کی مہورت اسی مہینہ میں نکالی جائے۔ جنم پتری پہلے ہی ملائی جا چکی تھی۔ پورے گن نہایت اچھی طرح ملے تھے۔ سنہا تا نے کہا کہ پنڈت ہند کشور چترویدی کے پاس جائیں اور ان سے مہورت نکلوائیں۔ سنہا جی اور جگدیش دونوں دوسرے دن صبح کے دس بجے پنڈت ہند کشور چترویدی کے مکان پہنچے۔ پنڈت جی کا مکان ساہوکاری کاروان میں تھا۔ پنڈت ہند کشور کے بیٹے نند کشور نے ابھی ابھی سنسکرت میں ایم اے کیا تھا۔ پنڈت ہند کشور ہندو مہا سبھا کے سرگرم رکن تھے۔ اب ضعیف ہو گئے تھے۔ جس وقت سنہا جی ہند کشور کے مکان پر پہنچے۔ پنڈت جی ابھی ابھی پوجا سے فارغ ہوئے تھے۔ نند کشور نے سنہا جی کو آدر مان سے بیٹھک میں بٹھلایا۔ تھوڑی دیر بعد پنڈت ہند کشور بھی آ گئے۔ کرانتی کی شادی کی مہورت کی بات نکلی۔ پنڈت جی بہت خوش ہوئے۔ بچپن سے وہ رام نارائن اور کرانتی کو جانتے تھے۔ پنڈت جی نے شادی کی مہورت بتلا دی۔ سنہا جی نے پنڈت جی کے سامنے دس روپے کا نوٹ رکھ کر دنڈوت کیا۔ پنڈت جی نے کہا یہ ٹھیک نہیں وہ تو میرے ہی بچے ہیں پر سنہا جی نے اصرار کر کے پنڈت جی کی جیب میں دس روپے کا نوٹ رکھ دیا۔ جگدیش بھی باپ کے ساتھ رخصت ہونا چاہتا تھا کہ نند کشور نے اس کو روک کر کہا کہ تم ٹھیر جاؤ دلی سے برج لال ویاس

آئے ہوئے ہیں۔ آج وہ ہمارے پاس آئیں گے۔ بڑے ودوان ہیں۔ ابھی دِلّی میں دھواں دھار تقریریں کی ہیں۔ الیکشن میں تو انھوں نے کایا پلٹ دی۔ رکشا چلا کر جگدیش نے باپ کو رکشا میں بٹھا دیا اور خود ٹھہر گیا۔ گیارہ بجے کے قریب برج لال ویاس آئے۔ آدر مان سے ان کو بٹھلایا گیا۔ پنڈت ہند کشور بھی بڑے پنڈت تھے۔ لیکن پرانے زمانہ کے۔ بھوجن کی تیاری شروع ہوئی۔ پنڈت ہند کشور کی بیٹی ومنتی نے بڑے سلیقہ سے رنگولی کی اور چوکے بنائے۔ ویسے تو کھانے والے صرف پانچ آدمی تھے یعنی پنڈت ہند کشور اور نند کشور۔ جگدیش۔ پنڈت برج لال ویاس اور ان کے ایک ساتھی۔ ہر ایک چوکے میں دو سرخ رنگ کے پٹے۔ آمنے سامنے۔ ایک پٹہ بیٹھنے کے لئے۔ دوسرے پٹے پر پتل۔ کنول کے تازہ پتے۔ پتوں پر رکھ دیئے گئے۔ ہر پٹے کے بازو ایک چاندی کا گلاس پانی پینے کے لئے اور ایک چاندی کی کٹوری چھاچھ کے واسطے۔ پرانے طریقے کے لحاظ سے ایک برادری دوسرے برادری کے ہاتھ کا چھوا نہیں کھاتی۔ خصوصاً کچی رسوئی میں تو سخت پابندی تھی۔ مثل مشہور ہے کہ نو کنوجیا اور دس چولھے۔ یعنی ایک چولھا میں آگ سلگائی جاتی اور ہر ایک اس چولھے سے آگ لیتا۔ ایک شخص دوسرے شخص کے چولھے کی آگ نہیں لیتا۔ اب تو نئی روشنی میں چھوت چھات کی بات پاپ۔ پہلے ایسا ہوتا تھا کہ ایک کمرہ میں اگر راکھ کی لکیریں ڈال دی جائیں تو سب الگ الگ چھوت چھات پھر نہیں رہتا۔ اس لئے کہ حد بندی ہو گئی۔ نئے زمانہ میں چھوت چھات چلانا بھی ہے۔ اور یہ بھی ظاہر نہیں ہونے دیتا کہ چھوت چھات مانا جاتا ہے۔ بس اس کے لئے رنگولی کی تدبیر ہاتھ آئی۔ نہایت خوب صورتی سے رنگ بہ رنگ کے لکیروں کے چوکے بنا دیئے گئے۔ بھوجن کا کمرہ سلیقہ سے سج گیا۔ اب برہمن کشتری ویش اور شودر۔ مسلمان پارسی

اور عیسائی سب ایک ساتھ کھانے پر بیٹھ سکتے ہیں۔ کھانا پروسنے والی گھر کی بہو بیٹیاں۔ دال۔ چاول۔ ساگ۔ روٹی۔ پانی سب وہ دیں گی۔ ہر ایک مہمان اپنی جگہ بیٹھے کھائے اور اُٹھے۔ چھوت چھات کی کوئی بات ہی نہیں رہی۔

پنڈت برج لال ویاس اور ان کے ساتھی۔ جگدیش۔ پنڈت ہند کشور اور نند کشور کھانے سے فارغ ہو کر بیٹھنے کے کمرہ میں آئے۔ پان سے تواضع ہوئی۔ اِدھر اُدھر کی باتیں شروع ہوئیں۔ پنڈت برج لال ویاس نے کہا۔

پنڈت برج لال ویاس۔ ابھی میں پرسوں دلّی سے آیا۔ دلّی میں پھر ہما ہمی شروع ہو رہی ہے۔ جدھر دیکھو بم پھٹنے کی آواز۔ پٹاخوں کی آواز۔ میری سمجھ میں نہیں آتا یہ قصہ کب تک چلے گا۔ مسلمانوں نے پاکستان مانگا۔ ہم نے پاکستان دیدیا۔ اب بھی ہم کو چین سے بیٹھنے نہیں دیتے۔ یہ سب خرابی اس وجہ سے ہے کہ جس بنا پر مسلمانوں نے پاکستان مانگا اور پاکستان بنایا اس بنا کو ہم نہیں مان رہے ہیں۔ مسلمانوں نے مذہب کی بنا پر دو قومی نظریہ پیش کیا اور بہ حیثیت مسلمان انھوں نے پاکستان لیا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم اپنے کو ہندو بولتے شرماتے اور ہندوستان ہندوؤں کا ملک ہے کہنے سے پیچھے ہٹتے ہیں۔ یہ ہمالیہ پربت یہ بڑے بڑے دریا پھر ہمارے دونوں طرف مہا ساگر اس دیش میں ہندو دھرم نے جنم لیا۔ ہمارے چار وید جن میں ہمارے جنم سے لیکر ہمارے مرن تک بلکہ اس کے بعد کے بھی کارن دھرے ہیں۔ پھر ہمارے اپنشد جو آتما گیان اور پرماتما گیان سکھاتے ہیں پھر ہمارے پران سب کا نچوڑ بھگوت گیتا۔ ہمارے رشی، مہارشی جو ان سب کا ٹیکا کار کرئے۔ ہم کو کس چیز کی کمی ہے۔ ہر چیز ہمارے پاس موجود ہے۔ پھر ہم کو کیوں لجا آتی ہے کہ ہم ہندوستان کو ہندوؤں کا ملک اور اپنے کو ہندو بولنے

شرماتے ہیں۔ یہ ہندوستان نہیں بھارت دیش ہے۔ اور اس بھارت دیش کے ہم سب سپتر ہیں۔ ہم کو ہر طرح کا ادھکار ہے کہ اس پیارے دیش کو صرف اپنا بولیں۔ ہم کو اس دیش کی ہر چیز سے پیار ہے اس کے پہاڑ سے پیار ہے اس کے دریاؤں سے پیار ہے اس کے سمندروں سے پیار ہے اس کی دھرتی سے پیار ہے۔ اس کے جنگل سے پیار ہے اس کے درکش سے پیار ہے۔ اس کے جانوروں سے پیار ہے۔ اس سورج سے پیار ہے جو ہر روز ہمارے دیش کو گرماتا ہے۔ اس چاند سے پیار ہے جو ٹھنڈی روشنی دیتا ہے۔ یہ سب ہمارے دیوتا ہیں۔ ہم ان کی پوجا کرتے ہیں۔ ان کے گن گاتے ہیں۔ پھر کیوں نہ ہم اس کو اپنا دیش کہیں۔ ہمارے ماتا پتا سب اس دھرتی سے اٹھے اور پھر اس دھرتی میں سما گئے۔ ہم بھی اس دھرتی سے اٹھے ہیں اور اس دھرتی میں سما جائیں گے۔ ہماری آل اولاد اس دھرتی سے اُٹھے گی اور اس دھرتی میں سما جائے گی۔ ہمارے رشیوں منیوں اور مہاتماؤں نے گیان اور وگیان سب کی باتیں سکھا دی ہیں وہ ایسی باتیں ہیں جو آج بھی اٹل ہیں۔ اور انہی کے سہارے ہم اپنی زندگی بنا سکتے ہیں۔ ہم کو کیا ضرورت ہے کہ دوسروں کی نقل کریں۔ ہمارے پاس کس چیز کی کمی ہے کہ ہم دوسروں سے لیں۔ راج نیتی کے ہمارے پاس وہ اصول بتائے گئے ہیں جو آج بھی اپنی جگہ اٹل ہیں صرف ان پر چلنا شرط ہے بس لوگ مغربی ڈپلومای کے پیچھے پڑے ہیں۔ جس کو سر ہے نہ ٹانگ گانے بجانے میں آؤ تو ہمارے پاس وہ راگ راگنیاں ہیں کہ دنیا نے آج بھی ویسا ایک راگ یا راگنی پیدا نہیں کی۔ روگ بیماری کے آیورویدمیں وہ علاج ہیں کہ آج بھی ان بیماریوں کا علاج ہو سکتا ہے۔ جس کے متعلق آلوپیتی بار مان چکی ہے۔ بس اب ہوائی جہازوں کی ڈینگ ماری جاتی ہے۔ کیا ہمارے پاس بمان اور اڑن کھٹولے

نہیں تھے آج ایٹم بم اور ہیڈروجن بم سے ڈرایا جاتا ہے۔ کیا ہمارے پاس اگنی بان اور دوسرے شستر نہیں تھے۔ اس زمانہ میں ایسے شستر تو ہی استعمال کر سکتے تھے جو اس کے یوگیہ تھے۔ اب دیکھو ہر ایک کے قبضہ میں ایٹم بم۔ دنیا تباہ نہ ہو تو پھر کیا ہو۔ اب دنیا میں شانتی لانے کے لئے ہم کو اپنے وید شاستر کے آدھار پر چلنا ہوگا۔

جگدیش۔ معاف کرنا پنڈت جی۔ پدرم سلطان بود کہنے سے کیا ہوتا ہے دیکھنا یہ ہے کہ اب ہم کیا ہیں۔ دنیا میں بھاپ دریافت ہوئی۔ پٹرول دریافت ہوا۔ اب تو ایک نیا فیول دریافت ہوا ہے جس سے انسان چاند میں جا سکتا ہے۔ زمین کے اطراف گھوم سکتا ہے۔ معلوم نہیں آگے اور کیا کیا کرے۔ اب ریل چل رہی ہے۔ موٹر چل رہی ہے۔ پانی کے جہاز چل رہے ہیں۔ ہوائی جہاز چل رہے ہیں۔ اس زمانہ میں تو صرف دیوتا ہی اُڑ سکتے تھے۔ آپ ہم میں بھی بمان پر اڑ سکتے ہیں۔ اس دھرتی کے آگے پیچھے اور نیچے جہاں چاہے جا سکتے ہیں نئی نئی دوائیں ایجاد ہوئی ہیں جو موذی سے موذی بیماری کو بھی دور کر سکتی ہیں۔ اس زمانہ میں کتنے لوگ پیٹ کے درد سے مر جاتے تھے۔ بس سُول کا درد ہے کہہ کر ٹال دیا جاتا تھا۔ آج دو منٹ میں آپریشن پھر اچھے خاصے چلتے پھرتے۔ کتنے بچے نمونیا سے مرتے تھے اور ڈبے کی بیماری کہہ کر ٹال دیا جاتا تھا۔ اب اس موذی مرض سے کتنے بچے بچ جاتے ہیں۔ معاف کرنا اس زمانہ میں رشیوں منیوں کی بھرمار تھی۔ اب کیوں رشی مُنی پیدا نہیں ہوتے۔ کیا اس زمانہ میں رشی مُنی بننے کا ٹھیکہ تھا جو اب بند ہو گیا۔ کیا اس زمانہ کے لوگوں کو گیان اور وگیان کی باتیں کرنے کا حق تھا۔ کیا اب ہم کو اس کا حق نہیں ہے کہ اس گیان اور وگیان کی باتوں میں اضافہ کریں۔ ان میں غلطیاں ہوں تو ان کو درست کریں۔ کیا اب ہم رشی مُنی نہیں ہو سکتے۔ اگر نہیں ہو سکتے تو کیوں

نہیں ہو سکتے۔ کس نے ہم کو رشی منی بننے سے روکا ہے۔ آپ مانتے ہو کہ ہمارا دھرم ہندو دھرم کوئی لکیر کا فقیر نہیں ہے۔ یہ کوئی مذہب نہیں ہے۔ کہ بس اس میں جکڑ جائیں۔ ہم گیان پر گیان بنائیں گے وگیان پر وگیان بنائیں گے۔ نئے راگ بنائیں گے نئے راگنیاں بنائیں گے۔ نئی راج نیتی بنائیں گے۔ نئی دنیا بنائیں گے۔ نیا ہندوستان بنائیں گے۔ نیا بھارت ورش بنائیں گے۔

اب ہم کو ضرورت اس کی ہے کہ کشمکش کریں جدوجہد کریں۔ اس سنسار کو اپنا سیوک بنائیں یہ سنسار ساری دھرتی کے انسانوں کا سیوک ہو جائے۔ بس ہم وہ کام کریں۔ ہم کو شانتی پیہ کی ضرورت نہیں ہے۔ ضرورت ہم کو اس کی ہے کہ سنسار کو انسان کا سیوک بنا چھوڑیں۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ ایک انسان کا حق دوسرا انسان کھا جائے بلکہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہر انسان کو سنسار سے لابھ ہو۔ ہم اس وقت وہ گیان نہیں چاہتے جس کی وجہ سے ہم اپنے اس وقت کے اس زمانہ کے کرتب سے غافل ہو جائیں۔ ہمارا ہر گھنٹہ ہر لمحہ اپنے ملک اپنے دیس بلکہ پورے پرتھوی اور اس کے باسیوں کی سیوا میں صرف ہو۔ اس پر ہمارا دھیان اٹل ہونا چاہیئے۔ اور ہمارا اس وقت سب سے بڑا یہی گیان دھیان ہے۔

دیکھیئے پنڈت جی۔ ہم ہمالیہ پر چڑھنا چاہتے ہیں۔ سمندروں کی موجوں پر چڑھنا چاہتے ہیں۔ ہوا میں اڑنا چاہتے ہیں آواز اور روشنی کی رفتار سے تیز جانا چاہتے ہیں۔ اسٹرونائٹ بننا چاہتے ہیں۔ یہ وقت ہمارے دھیان میں بیٹھنے کا نہیں ہے۔ جدوجہد کرتے رہنے کا ہے۔ یہ سب کریں گے ہم لیکن نشکام کام۔ یعنی اس میں ہماری خود غرضی نہ ہوگی۔ کرم کرم کی خاطر۔ لوگ ہمالیہ پر چڑھتے ہیں کس لئے۔ صرف چڑھنے کی خاطر۔

ہمارے کرم سے جگت کا بھلا ہوتا ہے۔ ہوا کرے۔ اس کی بھی ہم کو پرواہ نہیں۔ ہم تو کرتوے سمجھ کر کئے جائیں گے۔ ہمیں شا نتی شانتی نہ سکھائیے۔ شانتی نام موت کا ہے۔ آپ لوگ ہمیں جنگ سے ڈراتے ہیں۔ بڑے بوڑھے ہائے جنگ ہائے جنگ کی باتیں کرتے ہیں۔ دنیا میں امن کی باتیں کرتے ہیں۔ یہ جنگ سے ڈرنا ہی سب سے زیادہ امن کا دشمن ہے۔ جنگ ہوتی ہے۔ دنیا تباہ ہوتی ہے ہونے دو ایک دنیا تباہ ہوگی دوسری دنیا بنے گی۔ ایک درخت تباہ ہوگا۔ اس کی جگہ ہزار درخت کھڑے ہوں گے۔ کیا دنیا میں جنگ نہیں ہوئی۔ کیا جنگ کو دنیا میں روکا جا سکتا ہے۔ ہر جنگ دنیا کو نئے سرے سے زندہ کرتی ہے۔ دنیا نے اتنی جنگ دیکھے۔ کیا اس سے دنیا چھوٹی ہوئی۔ یہ جنگ کا خواب یہ ایٹمی جنگ کا خواب آپ لوگوں کو کیوں پریشان کر رہا ہے۔ ہم تو پریشان نہیں ہوتے کیا ہیروشیما سے جاپان مر گیا۔ کیا دوسرے جنگ عظیم سے جرمن مٹ گیا۔

؎ قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

ہر جنگ کے بعد سچائی کی روشنی بڑھتی ہے۔ لیکن جنگ ہوگی۔ اصول کی خاطر، دھرم کی خاطر، حق و ایمان کی خاطر۔ چاہے ہزار دنیا بنیں اور بگڑیں اصول و دھرم کے لئے سب کچھ قربان ہوگا۔

مہا بھارت اور کربلا دھرم و اصول کی خاطر ہی لڑی گئی تھی۔ عزیزوں، قرابت داروں کا قتل ہوا۔ خاندان کے خاندان تباہ ہوئے۔ صرف اصول کی خاطر۔ ہم اصول اور دھرم کی خاطر ہر قسم کی قربانی دیں گے۔ ہزارہا دنیا قربان کر دیں گے۔ یہ ہے ہم نوجوانوں کے دل کی آواز۔ آپ لوگ جواب سنیاس آشرم اختیار کرنا چاہیئے۔

براہ کرم ہمارے راستے سے ہٹ جائیں۔ ہمالیہ کے پہاڑوں میں آپ کے لئے بہت جگہ ہے۔ براہ کرم ہم کو اپنے حال پر چھوڑ دیجئے اور بس۔

پنڈت برج لال جی ویاس۔ بے شک بھیا تم جیسے سر بکف سرفروش نوجوانوں کی بھارت ورش کو ضرورت ہے۔ بے شک بھارت ورش کے ہر نوجوان میں یہی جذبہ ہونا چاہیے۔ لیکن بھیا تمہیں تھوڑے تجربہ کی بھی ضرورت ہے۔ تمہارے بھائی جواب مسلمان ہو گئے ہیں یا عیسائی ہو گئے ہیں۔ تمہاری اس بات کو مانیں تو بات ہے ورنہ تم اِدھر اونچے اونچے اصولوں کی باتیں کرتے رہو اور وہ اُدھر اپنے کو تم سے الگ کئے جائیں۔

بارہ ۱۲ بج چکے تھے۔ پنڈت ویاس جی جانے کے لئے اٹھنے لگے۔ رکشا منگوائی گئی۔ پنڈت ویاس اور ان کے ساتھی رکشا میں سوار ہندی بھون روانہ ہوئے۔ جگدیش بھی جانے تیار ہوا۔ نند کشور نے کہا کہ جگدیش تو نے تو آج کمال ہی کر دیا۔ پنڈت جی کو تو نے وہ لتھاڑا کہ بولتی بند ہو گئی۔ تو تو بس لیڈر ہوتا جا رہا ہے۔ پنڈت نند کشور اپنے آپ مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ جگدیش گھر روانہ ہو گیا۔

۵

کرانتی کے شادی کے دن آگئے۔ ۲۰ر جون کو کنیادان مقرر ہوا۔ ۲۱ر جون کی صبح کو بدائی۔ ۲۰ر جون سنیچر کا دن تھا اور ۲۱ر جون اتوار۔ ابھی آٹھ دن شادی کو باقی تھے۔ دونوں طرف دھوم دھام سے تیاری شروع ہوئی۔ سنہا جی نے دس دس ہزار کی دو پالیسیاں لے رکھی تھیں جو پک چکی تھیں۔ رقم انھوں نے بنک میں جمع کر دی تھی۔ دو ہزار کی پالیسی کی جو رقم ملی تھی۔ وہ تو رشیدہ کی شادی میں لگا دی۔ سنہا جی کو صرف ایک لڑکا جگدیش اور ایک لڑکی کرانتی۔ اُدھر برج نارائن چار سو روپیہ ماہوار وظیفہ پاتے تھے۔ رام نارائن چارٹرڈ اکونٹنس کا کام کرتا تھا۔ ماہانہ پانچ چھ سو کما لیتا تھا۔ کوئی خاص پس انداز نہیں تھا برکت پورہ میں رہتے تھے۔ اولاد بھی صرف ایک تھی۔ رام نارائن کی ماں من موہنی بڑے سلیقہ کی عورت تھی۔ گھر بار بہت کفایت سے چلاتی تھی۔ ایک ایک پیسہ پر نظر رکھتیں۔ گھر سے کھاتے پیتے اچھے ہی تھے۔ من موہنی کا زیور بھی دس ہزار روپے سے کم کا نہ تھا۔ مگر ذاتی تھا۔ من موہنی نے کہا کہ یہ میرا سب زیور بہو کو دیا جائے گا۔ برج نارائن نے کہا کہ یہ تمہارا زیور رہنے دو۔ بہو کے لئے تھوڑا اب بنا لیں گے۔ تھوڑا بعد میں بنا لیا جا سکتا ہے۔ من موہنی نے نہ مانا۔ اور کہا کہ میرا زیور آپ ہیں۔ جب تک آپ ہیں مجھے کسی زیور کی ضرورت نہیں۔ پھر میں کیا اس عمر میں زیور پہن کر پھروں گی جو کچھ ہے

سب بہو بیٹے کا۔ بہو آئی اور ہم ہردوار چلے۔ برج نارائن خود جاکر بہو کے لئے کپڑے لائے۔ دونوں طرف شادی کی تیاری شروع ہوئی۔ سہاجی کے یہاں تو قمر، ریحانہ اور ان کی والدہ کے ہاتھ میں خرید و فروخت کا انتظام تھا۔ روز آنہ بیگم ابوالہیا آتی جاتی تھیں۔ قمر کی بیوی رشیدہ بھی انتظامات میں موجود تھی۔ جمشید پور سے یہ دونوں کرانتی کی شادی کے لئے آئے تھے۔ زمانے میں سہنہ لتا کے تمام رشتہ دار موجود تھے۔ ایک شامیانے میں گوشت کے کھانے کا انتظام تھا۔ دوسرے شامیانے میں پاک کا چوکیاں نہایت سلیقہ سے لگائی گئی تھیں۔ مہمانوں کی چھوٹی سی چھوٹی تکلیف کا خیال کیا گیا تھا۔ کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ نہایت آرام سے مہمان آئے۔ اپنی اپنی جگہ بیٹھے اور پھر کھانے سے فارغ ہوکر ہاتھ دھویا۔ چھوٹے چھوٹے تولے ہر ایک کے لئے علٰحدہ علٰحدہ رکھے گئے۔ پانی میں برف نہیں ڈالی گئی بلکہ برف میں پانی کی صراحیاں جمادی گئی تھیں۔ نہایت صفائی سے پانی پلایا گیا۔ افراط سے گلاس رکھے گئے تاکہ جھوٹے گلاس استعمال میں نہ آئیں۔ خود قمر رشیدہ اور ریحانہ نگرانی کررہے تھے۔ ہر مہمان کی نہایت انکساری اور دلجوئی سے خاطرداری کی جارہی تھی۔ بارات ۸ بجے رات آگئی۔ کھانا دس بجے تک تمام ختم ہوا۔ مہمان رخصت ہوئے۔ قمر رشیدہ اور ریحانہ رات بھر ٹھیرے رہے۔ بارہ بجے کنیادان ہوا۔ سہاجی نہایت متاثر تھے۔ آنکھ سے آنسو جاری تھے۔ بہرحال کنیادان کے وقت ان کو آنا پڑا۔ پھیرے ہوئے اور سہاجی سیدھا اپنے کمرے میں چلے گئے۔ صبح کے پانچ بجے رخصتی عمل میں آئی۔

۶

۲۰ راگست کو خبر آئی کہ برج نارائن کو دل کا عارضہ ہوا۔ رات کے دس بجے تھے۔ کرانتی میکے آئی ہوئی تھی۔ سہاجی اور جگدیش کرانتی کو لیکر فوراً برج نارائن کے گھر پہنچے۔ برج نارائن پر بے ہوشی طاری تھی۔ صبح چار بجے برج نارائن نے آنکھ کھولی۔ رام نارائن کو بلایا۔ کرانتی کو یاد کیا۔ کرانتی موجود تھی۔ دس منٹ بعد دم چھوڑ دیا۔ صبح میں عزیز و اقارب دوست احباب سب کو اطلاع دی گئی کہ آرتی دس بجے اٹھے گی۔ ½۹ بجے تک سب عزیز و اقارب دوست و احباب برج نارائن کے مکان پر برکت پورہ میں جمع ہوگئے۔ پانسو سے کم آدمی نہیں تھے۔ پر مستورات بھی بہت سی تھیں۔ ½۱۰ بجے آرتی اٹھی۔ رام نارائن کفن پہنے انگیٹھی لئے آرتی کے سامنے تھے۔ تھوڑی دیر بعد میت کو لاری میں لے لیا گیا۔ چار لاریاں تھیں۔ اکثر لوگ اپنی اپنی موٹر کار میں تھے۔ سہاجی کو دوارکاناتھ چوبے کی موٹر کار میں سوار کرادیا گیا۔ جگدیش آرتی کی لاری میں سوار ہوگیا۔ بارہ بجے آرتی پرانے پل کے سمسان پہنچی۔ پہلی منزل جانجی جی کے مندر کے پاس دی گئی۔ سمسان میں داخل ہوتے ہی چتا کی تیاری شروع ہوئی۔ دونوں منڈپوں میں لوگ تقسیم ہوگئے۔ کچھ لوگ پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھے۔ بابو مکٹ بہاری لال یم یس سی۔ گنگاسرن ودیالنکار، پنڈت ہردے ناتھ شاستری۔ اور ڈاکٹر

نندکمار پی ایچ ڈی سب ایک جا بیٹھے۔ پنڈت ہردے ناتھ شاستری نے کہا۔

پنڈت ہردے ناتھ شاستری۔ دیکھو برج نارائن نے کیا اچھی موت پائی پینسٹھ[۶۵] برس کی عمر کو پہنچ چکے تھے۔ کوئی تکلیف نہیں۔ چلتے پھرتے بس چند گھنٹوں میں ٹھنڈی نیند سو گئے۔ لڑکا بڑا ہونہار۔ بہو بھی تعلیم یافتہ اور بڑے سلیقہ اور رویہ کی۔ من موہنی ودھوا ہو چکیں۔ لیکن بہت شانت۔ آنکھ سے آنسو نہیں نکلے۔ پتھر بن کر بیٹھی رہیں۔ میت کی پوری تیاری کی اور اطمینان سے آرتی کو باہر بھجوایا۔ برج نارائن نے اپنی حیات میں کبھی کسی کو دکھ نہیں پہنچایا۔ سب سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ یہ سب ان کے پچھلے جنموں کے کرموں کا پھل ہے۔ ورنہ ایسی اچھی موت کس کو ملتی ہے۔ اور آئندہ بھی آشا ہے کہ وہ کسی اچھی جیونی میں جائیں گے۔

گنگا شرن ودیا النکار۔ ہاں ہاں شاستری جی آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اس جنم میں منش کو جو پھل ملتے ہیں وہ سب پچھلے جنموں کے کرموں کے کارن ہیں۔ ورنہ ایک منش دلدر کیوں ہوا اور دوسرا مالدار کیوں۔ ایک روگی تو دوسرا صحت مند۔ یہ آتما جیونی بدلتی رہتی ہے۔ جیسے جیسے کرم ایک جنم میں کئے ہیں اس کے پھل دوسرے جنم میں ملتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر نندکمار سے رہا نہ گیا۔ انھوں نے پوچھا۔ **ڈاکٹر نندکمار۔** معاف کرو شاستری جی۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ بھگوان نے کل کتنے آتما پیدا کئے تھے۔ کیا بھگوان نے اس کے بعد نئے آتما پیدا کرنا چھوڑ دیا۔ جو آپ فرماتے ہیں کہ وہی آتما جیونی بدلتی رہتی ہے۔ پھر کیا یہ آتما صرف اس دنیا میں چکر لگاتی رہتی ہیں۔ یا اس عرصہ میں کسی دوسری دنیا کی بھی سیر کرتی رہتی ہے۔

پنڈت ہردے ناتھ شاستری۔ بھئی تم فلاسفروں سے کون بحث کرے۔ تم میں نہ دھرم ہے اور نہ تم کو اپنے رشی منیوں کے کہنے پر وشواس۔ وید شاستر کو ہاتھ نہیں لگایا۔ پس انگریزی پڑھی چند فلسفہ کی کتابیں پڑھیں اور اپنے وید شاستروں پر ہی نکتہ چینی کرنے لگے۔

ڈاکٹر نندکمار۔ نہیں شاستری جی یہ بات نہیں ہے۔ یہ سائنس اور تلاش کا زمانہ ہے۔ لوگوں کی عقلیں بہ نسبت پہلے کے زیادہ پختہ ہو چلی ہیں۔ وید شاستر کی ہی بات کیجئے لیکن اس طرح فرمایئے جس سے ہمارے دماغ مطمئن ہو جائیں۔ ہمارے رشی منیوں نے جو کچھ کہا اور جس حد تک کہا وہ سچ کہا۔ انھوں نے اپنی زندگیاں گیان کی تلاش میں صرف کر دیں لیکن ہماری گذارش ہے کہ ہم کو بھی رشی منی بننے دیجئے۔ ہمارے باپ دادا رشی منی ہی تھے۔ ہم انہی رشی منیوں کی اولاد ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم رشی منی نہیں بن سکتے۔ اس زمانہ کے لحاظ سے ان رشیوں منیوں نے جو کہا اور جس حد تک کہا سچ تھا۔ اب ہم کو ہمارے زمانہ کے لحاظ سے سوچ بچار کرنے گیان دھیان کرنے اور اپنے وچار پرگٹ کرنے کا موقع دیجئے۔

اب یہ موت کو ہی لیجئے موت کیا ہے۔ برج نارائن جی مر گئے۔ رام نارائن رو رہے ہیں۔ من موہنی رو رہی ہیں اُن کی بہو کرانتی رو رہی ہے۔ کیوں؟ کیا برج نارائن بھی رو رہے ہیں۔ کیا برج نارائن اب ہی مرے نہیں۔ برج نارائن پیدائش کی تاریخ سے مرنے کی گھڑی تک ہر منٹ ہر سکنڈ مرتے آئے ہیں۔ پینسٹھ[۶۵] برس کی عمر میں جو برج نارائن مرے وہ وہ برج نارائن نہیں تھے جو پیدائش کے وقت تھے۔

جوجوانی کے وقت تھے۔ بچے برج نارائن بچپن ختم ہوتے ہی مرگئے۔ جوان برج نارائن جوانی ختم ہوتے ہی مرگئے۔ اور بوڑھے برج نارائن آج مرگئے۔ یہی نہیں بلکہ اس بچپن، جوانی اور بڑھاپے میں۔ وہ ہر آن ہر گھڑی مرتے گئے۔ نہ صرف ان کا تن مرا نہ صرف ان کے تن کا ہر حصہ مرا بلکہ برج نارائن جس کو "میں" برج نارائن سمجھتے تھے۔ وہ ہر گھڑی مرتا گیا۔ برج نارائن کے بچپن کا "میں" جوانی میں نہیں تھا۔ اور برج نارائن کی جوانی کا "میں" بڑھاپے میں نہیں تھا۔

پھر دیکھو تم سمجھتے ہو کہ تم دیکھ رہے ہو۔ اچھا اپنی آنکھ بند کرلو اور دیکھو نہیں دیکھ سکتے۔ کیوں۔ اس وجہ سے کہ تم "یہ جو تم" آنکھ سے ظاہر ہو رہے ہو۔ آنکھ نہیں تو تم غائب۔ تمہاری ہر اندری کا یہی حال ہے۔ خواہ وہ تمہاری ظاہری اندریاں ہوں یا باطنی اندریاں۔ اس کے بعد تم اپنی آنکھیں پوری طرح کھلی رکھو۔ تمہاری بینائی نہایت اچھی۔ روشنی بھی نہایت کافی۔ اس پر تمہارے سامنے ایک خوب صورت مجسمہ کھڑا رہے۔ لیکن تمہارا دھیان کسی مسئلہ میں الجھا ہوا ہو۔ باوجود تمہاری بصارت اچھی ہونے کے اور تمہارے سامنے بالکل نزدیک خوب صورت مجسمہ ہونے کے تم کو وہ مجسمہ نظر نہیں آتا۔ کیوں؟ اس وجہ سے کہ دیکھنے والا "تم" اس آلہ میں نہیں دیکھ رہا ہے۔ اچھا اگر تم کو تھوڑا سا کلوروفارم دیدیا جائے۔ تمہاری آنکھ بھی اچھی۔ تم بھی اچھے تندرست۔ پھر بھی نہیں دیکھ سکتے۔ کیونکہ دماغ کا وہ حصہ جس مقام سے تم اپنے کو ظاہر کرتے ہو معطل کردیا گیا۔ پس معلوم ہوا کہ "تم" کوئی بالذات الگ ہستی نہیں ہو تمہارے شریر سے۔ تم اور تمہارا شریر ساتھ ساتھ مر رہے ہیں۔ اور پھر پیدا ہو رہے ہیں اور پھر مر رہے ہیں اور پھر پیدا ہو رہے ہیں۔ تم اپنے کو جو بالذات ہستی بچپن سے ضعیفی تک سمجھتے ہو تمہارے گزرے ہوئے زمانہ کا ایک واہمہ ہے۔ ہر گزری

ہوئی چیز مر چکی اور جیسے جیسے گزرتی جارہی ہے مرتی جارہی ہے۔

برج نارائن صرف اب ہی نہیں مرے بلکہ پیدائش سے اب تک مرتے آئے ہیں۔ اگر انھوں نے ذرا غور کیا ہوگا تو محسوس کیا ہوگا کہ وہ ہر لمحہ شریر کے اور آتما کے ہر طرح سے مرتے آئے ہیں اور پیدا ہوتے آتے ہیں۔ ان کے ہر لمحہ مرنے اور پیدا ہونے میں فصل نہ ہونے کی وجہ سے ہم ان کو مسلسل زندہ سمجھ رہے تھے۔ لیکن اب ہم کو صرف ان کا شریر نظر آرہا ہے۔ آتما نہیں دکھائی پڑتی۔ یہ شریر جو ان کی آتما کی موجودگی میں ایک طریقہ سے سڑ گل رہا تھا۔ اور مر رہا تھا۔ اب دوسرے طریقہ سے گل رہا ہے۔ اور مر رہا ہے۔ جب شریر مر رہا تھا تو اس کے ساتھ ساتھ دوسرا شریر بلا وقفہ کے پیدا ہو رہا تھا۔ اب جو شریر مرا ہے تو ویسا ہی دوسرا شریر ساتھ ساتھ نہیں پیدا ہو رہا ہے۔ اس لئے ہم سمجھ رہے ہیں کہ برج نارائن مرگئے۔

رہا برج نارائن کی آتما والا معاملہ اگر یہ آتما الگ ہے بھی تو سوال یہ ہے کہ کیا اس آتما کا نام اب بھی برج نارائن ہے کیا اس کے وہی جذبات و خیالات ہیں جو اس شریر کے تعلق سے تھے۔ اگر اس شریر کے تعلق سے خیالات و جذبات اب بھی باقی ہیں تو ان کے اس سے پہلے کے شریر کے خیالات و جذبات بھی باقی رہنا چاہیئے۔ اس طرح آگے بڑھو تو معاملہ بالکل گڑبڑ ہو جائے۔ اس لئے ماننا پڑے گا کہ اس شریر کے چھوٹنے کے ساتھ آتما میں شریر کے تعلق سے کوئی خیالات و جذبات باقی نہیں رہتے اگر ایسا ہے تو ہم کو اس آتما سے کیا غرض۔ ہم کو تو صرف اس آتما سے غرض تھی جو اس پڑے ہوئے مردہ شریر کے تعلق سے تھی۔ اور جس کا نام برج نارائن تھا۔ اب ہم اس شریر کو مٹی میں مٹی پانی میں پانی آگ میں آگ اور ہوا میں ہوا کردیں گے اور بس۔

ع نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا

مرنے سے پہلے مرنے والے کو نفسیاتی تکلیف اکثر ہوتی ہے۔ اس کی وجہ اس کے غلط خیالات ہوتے ہیں جو بچپن سے اس میں قائم کرا دیئے گئے۔ یہ تکلیف بھی سانس نکلنے تک ہے سانس نکلنے کے بعد قصہ ختم۔

دراصل تکلیف کا سماں اس کے عزیز و اقارب دوست احباب پیدا کرتے ہیں۔ مرنے والا کسی کا ذریعہ معاش ہوتا ہے۔ کسی کا سہارا ہوتا ہے۔ کسی کو اس سے محبت ہو جاتی ہے۔ اور ایک دم جدائی شاق گزرتی ہے۔ اگر زندگی کی اسکیم ایسی بنے کہ مرنے والا نہ کسی کا ذریعہ معاش ہو نہ کسی کا سہارا تو اس کی میت اٹھانے بھی لوگ نہیں ملیں گے۔

پنڈت ہردے ناتھ شاستری۔ بھیا آپ فلاسفر ٹھیرے ہم آپ سے کیا بحث کر سکتے ہیں۔ بھیا فلسفہ اور چیز ہے اور کرم دھرم اور چیز۔ پہلے آپ اپنے دھرم کی کتابیں پڑھو۔ دھرم شاستر پڑھو۔ رشی منیوں کے اپنشد پڑھو۔ اس پر عمل کرو۔ پھر آپ کو معلوم ہوگا دھرم کیا ہے۔ مرنا کیا ہے جینا کیا۔

بابو نکمٹ بہاری لال۔ ڈاکٹر نند کمار نے جس حد تک کہا ٹھیک ہی کہا۔ لیکن اس سے بھی آگے جانا۔ اور خود ان کی سائنس اس سے آگے لیجاتی ہے۔ مادّہ MATTER کوئی بے جان چیز نہیں جیسا کہ اب تک سمجھتے آ رہے تھے۔ سائنس نے یہ معلوم کر لیا کہ جس کو ایٹم کہتے ہیں وہ کوئی بے جان چیز نہیں ہے۔ نیل بوہر NIELS BOHR نے معلوم کر لیا کہ ایٹم کا ایک نیوکلیس ہوتا ہے۔ جس کے اطراف تیارے ELECTRONS گھومتے رہتے ہیں۔ پھر ان دونوں کو فرمی

پھر یہ کیا ہے کہ موت کے نام سے دنیا کانپتی ہے۔ بڈھے سے بڈھا ڈرتا ہے۔ بھیانک خواب پڑتے ہیں۔ بوڑھا، جوان، بچہ سب ڈرتے ہیں۔ بات کچھ نہیں۔ قدرت نے ہر جاندار میں SELFPROTEETIEN اپنے بچاؤ کا مادّہ رکھا ہے تاکہ جس حد تک اس کو زندہ رہنا چاہیئے اور قدرت کا جو کام ہونا ہے وہ ہوتا رہے۔ حضرتِ انسان نے اس کو ایک تماشا بنا رکھا ہے۔ بالخصوص آج کل۔ موت کب آتی ہے کب آئے گی نہیں معلوم لیکن ابھی سے ٹھنڈے پسینے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ ڈر اور دہشت کیوں۔ کچھ تو بچپن کی غلط تعلیم بلکہ زیادہ تر جوانی کی غلط تعلیم کا نتیجہ ہے۔ اور کچھ ماحول ہی ایسا ہے۔ لیکن اصل ڈر کی وجہ لاعلمی اور اندھیرا پن ہے۔ بچے کو اندھیرے میں جانے کے لئے کہو نہیں جاتا۔ ڈرتا ہے۔ اس لئے کہ وہ نہیں جانتا کہ اندھیرے میں کیا ہے۔ بچے کو پانی میں کودنے کے لئے کہو۔ ڈرتا ہے۔ اسلئے کہ وہ نہیں جانتا کہ پانی میں کیا ہوگا۔ ایک دو مرتبہ کودا پھر آپ روکو تو بھی کودے گا۔

پچھلے زمانہ میں آپریشن کرانا گویا موت کے منہ میں جانے کے برابر تھا۔ اب لوگ پانچ پانچ چھ چھ آپریشن کراتے ہیں۔ چونکہ مرنے کے بعد کیا ہوگا۔ ہم نہیں جانتے اس لئے مرنے سے ڈرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ مذہبوں نے مرنے کے بعد کے حالات کے جو خوفناک نقشے کھینچے ہیں۔ اس کی وجہ سے بیچارہ مرنے سے پہلے ہی مر جاتا ہے۔

جیسے پیدا ہونا ایک قدرتی فعل ہے ویسے مرنا بھی قدرتی فعل ہے۔ تکلیف دراصل بیماری کی ہوتی ہے اپنے اعضا کا کام رکنے سے تکلیف معلوم ہوتی ہے۔ وہ بھی اگر آپ کا دماغ معطل ہو جائے اور احساس باقی نہ رہے تو پھر کوئی تکلیف نہیں۔ جیسے آئے ویسے چلے۔ شاعر نے کیا خوب کہا۔

ENRICO FERMI نے اس ایٹم کو توڑ دیا جو ایٹم بم کی بنا ثابت ہوا۔ معلوم ہوا کہ مادہ جس کو جامد و ساکت کہتے تھے۔ ہے ہی نہیں۔ سب حرکت ہی حرکت جب نظر آئے تو حرکت اور جب نظر نہ آئے تو قوت پھر جاندار بھی ایسا جاندار کہ دنیا اڑ جائے۔ ایک ایٹم کا یہ حال ہے تو سارے کائنات کا کیا حال ہوگا۔ یہ کائنات جس کو ہم مادہ سمجھ رہے ہیں کیا ہوگی۔ اس کے ساتھ اگر نظام کائنات کو دیکھیں تو اس میں شعور ہے۔ ایک باقاعدگی ہے۔ سمجھ ہے۔ پھر ایسا شعور اور باقاعدگی اور سمجھ کہ جب وہ نظام ہمارے چھوٹے سے شعور سے اونچا ہو جائے تو ہم چکرانے لگتے ہیں۔ اس طرح دیکھو تو نہ کوئی مرتا ہے نہ جیتا ہے۔ ایک ہی چیز ہے۔ مافوق الشعور بھی یہ عین الشعور بھی۔ اور تحت الشعور بھی۔ سب کچھ وہی ہے۔ وہی ہو رہا ہے۔ وہی دیکھ پڑتا ہے۔ وہی غائب ہو جاتا ہے۔ اس طرح ہم اپنے ویدانت پر آ جاتے ہیں۔ جسکو بکھان کر ہمارے رشیوں منیوں نے کہا ہے اور یہ ہمارے موجودہ رشی منی جیسے ڈاکٹر نند کشور جس کو اب ہم ڈاکٹر کہتے ہیں۔ کیوں رشی منی نہیں ہیں۔ بس فرق اتنا ہے کہ انکو کاج میں لگے رہنا بیوی بچے پالنا۔ تنخواہ اور گریڈ کی فکر کرنا۔ حکومت کے آگے ہاتھ پھیلائے رہنا پڑتا ہے۔ اگر یہ لوگ ان چیزوں سے آزاد ہو جائیں اور جیسا کہ پچھلے زمانہ کے رشی منی ہمالیہ میں بیٹھ کر اپنا تن من دھن گیان میں لگا دیتے تھے۔ ایسے یہ بھی لگا دیں تو پھر ہمارے پاس بڑے بڑے رشی منی پیدا ہوں۔

اس عرصہ میں چتا پوری روشن ہو گئی۔ کپال تیار ہوا۔ رام نارائن نے کپال کی رسم انجام دی۔ لوگوں نے پنچ لکڑی ڈالی پرنام کیا اور اپنے اپنے گھر سدھارے۔

٧

برج نارائن کو مر کر ایک سال ہو گیا۔ رام نارائن کا کاروبار ٹھیک سے چلنے لگا۔ ماہانہ کوئی ہزار پندرہ سو روپے مل جاتے تھے چار کمپنیوں میں آڈیٹری کا کام کرتے تھے۔ ان کے یہاں ایک لڑکا بھی ہوا۔ کرانتی نے گوپی ایس۔ سی بائیو کمسٹری فرسٹ کلاس کیا تھا۔ لیکن نوکری جمی نہیں۔ ویسے بھی بچے کی وجہ سے گھر کے کام کاج سے فرصت نہ ہوتی تھی۔ من موہنی ساس تھیں۔ لیکن کام کاج میں ان کا جی نہیں لگتا تھا۔ برج نارائن کے انتقال کے بعد سے کچھ اداس سی رہتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک دم ضعیفی آ گئی ہے۔ سر کے بال سب سفید ہو گئے۔ چلنے پھرنے میں تکلیف محسوس کرتی تھیں۔ چولھے کے پاس بیٹھتیں لیکن بہت جلد تھک جاتیں۔ مزاج کی پہلے سے سخت تھیں اب اور بھی سخت ہو گئی تھیں۔ نوکروں پر بڑا رعب داب رکھتیں۔ گھر میں ایک مزدورنی تھی باہر ایک چھوکرا۔ مزدورنی روز گھر دھوئے۔ چوکا لیپے۔ برتن صاف کرے اور اوپر سے روز کے کپڑے بھی دھونا پڑے۔ گھر میں بچہ ہوئے بعد سے تو اور کام بڑھ گیا تھا۔ چھوکرا گھر جھاڑ پونچھ دیتا سودا سلف لا دیتا اور چاء کا انتظام کر دیتا۔ لیکن من موہنی کے مزاج میں حد سے زیادہ صفائی تھی۔ کہیں کونے میں بھی ذرا کچرا دیکھ پایا کوئی برتن ذرا میلا دکھا یا چار کی پیالی پر ذرا دھبہ رہا بس آفت آ گئی۔ ویسے تنخواہ

معقول تنخواہیں اور دوسرے طریقہ سے بھی سلوک کرتیں۔ لیکن کام لینے میں ذرا بھی مروت نہ تھی۔ اس زمانہ میں نوکروں پر اتنی سختی چل نہیں سکتی لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ وہی اپنی پرانی لکڑی ہانکتی تھیں۔ نتیجہ یہ کہ مہینے مہینے پندرہ پندرہ روز میں نوکر بدلتا۔ رام نارائن لاکھ سمجھاتے کہ نوکروں پر اتنی سختی ٹھیک نہیں اسپر وہ خود رام نارائن پر الجھ جاتیں۔ چنانچہ اب دونوں نوکر غائب تھے۔ من موہنی کمر کے درد سے لیٹ گئیں۔ کرانتی کو ہی کھانا پکانا۔ برتن مانجنا اور کپڑے دھونا پڑا۔ صبح کے دس بجے کرانتی برتن مانج رہی تھی کہ باہر کی گھنٹی بجی۔ ابھی رام نارائن دفتر نہیں گئے تھے۔ باہر گئے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ قمر اور رشیدہ دونوں دروازے پر موجود۔

قمر۔ ہلو رام نارائن۔ دو روز ہوئے کہ ہم لوگ کلکتہ سے آئے ہیں۔ ہم نے طے کیا کہ تمہارے گھر پر اچانک دھاوا کریں۔ پس بغیر اطلاع کے ہم آ گئے۔ کہو اچھے تو ہو۔ ہاں اجی وہ تمہارا منا کہاں ہے۔ رشیدہ منا کے واسطے گڑیا لائی ہے۔ کرانتی جی جی کہاں ہے اب تک نہیں آئی۔ کرانتی برتن مانجنا ادھورا چھوڑ باہر آئی۔ رشیدہ سے گلے ملی۔ قمر سے کہا ہاں اب تو تم بڑے انجنیر ہو گئے ہو ہم کو کیوں پوچھیں گے۔ خط نہ خطوط بس اچانک آدھمکے۔

قمر۔ ہاں جی جی۔ ہم نے تو طے کیا تھا کہ بالکل اچانک پہنچیں گے۔ ارے جی جی یہ تمہارے ہاتھوں کا کیا حال ہے۔ یہ تمہارے کپڑے کیسے میلے ہیں۔

کرانتی۔ بھیا کیا کہوں دو دن سے نوکر غائب۔ اب مجھ ہی کو برتن انجنا کپڑے دھونا اور کھانا پکانا پڑتا ہے۔ ماں جی کی طبیعت بھی کچھ دن سے ٹھیک نہیں ہے۔ وہ چولھے کے پاس نہیں آتیں۔

قمر۔ ہاں جی جی۔ اب نوکروں کو بالکل بھول جاؤ۔ اب نوکر نہیں ملے گا۔ تم لوگوں نے حیدرآباد میں آدمیوں کو نوکر بنا کر بہت ظلم کیا ہے۔ اب اس کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ اب نوکر اور مالک والا معاملہ ختم ہو گیا۔ اب سب ہی مالک ہیں اور سب ہی نوکر۔ اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرنا۔ گھر جھاڑنا۔ برتن مانجنا۔ کپڑے دھونا۔ کھانا پکانا۔ سودا سلف لانا سب کام آپ کو ہی کرنا پڑے گا۔

کرانتی۔ میں سب کام کرنے تیار ہوں۔ میں پیچھے نہیں ہٹتی۔ لیکن مصیبت اس بڑے گھر کی وجہ سے ہے۔ بمبئی کے ویسے اگر چھوٹے چھوٹے فلاٹ ہوں تو ہم خود سب کام کر لے سکتے ہیں۔ سودا سلف بھی نزدیک دکان سے لا لے سکتے ہیں۔ ہوٹل سے بھی کچھ انتظام کر لیا جا سکتا ہے۔ لیکن حیدرآباد کی دنیا الگ ہے۔ یہاں گھر جھاڑنے جھٹکنے ایک آدمی چاہیئے۔ کھانا پکانے ایک آدمی چاہیئے۔ برتن مانجنے اور کپڑے دھونے ایک آدمی چاہیئے پھر ادھر خاطر داری کو ایک آدمی۔ یہ جاگیرداری نظام اب تک چلا آ رہا ہے۔ مکان اتنا بڑا ہے کہ بغیر نوکر کے کام نہیں چلتا۔

قمر۔ نہیں جی جی۔ ہم تو جمشید پور میں ایک فلاٹ میں رہتے ہیں۔ رشیدہ سب کام سنبھال لیتی ہے۔ حالانکہ میری تنخواہ دو ہزار روپے ہے۔ لیکن میں ایک آدمی مستقل طور پر نہیں رکھ سکتا۔ چھوٹے کام کے آدمی آتے ہیں اور وقت پر کام کر کے چلے جاتے ہیں۔ ڈرائنگ روم کی صفائی۔ کھانا پکانا سب رشیدہ کر لیتی ہے۔ تم تو جانتی ہو کہ رشیدہ پہلے سے گھر کے کام کاج میں ماہر ہے۔ ہم کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ بس رشیدہ صاحبہ گھر کی مالک ہیں۔ رشیدہ کی وجہ سے ہم ماہانہ ایک ہزار روپیہ بچا لیتے ہیں۔

رشیدہ۔ جی بس جناب گھر کا مالک بنا کر خوب نوکری لینا جانتے ہیں آپ

کرانتی۔ اچھا تم لوگ بیٹھو میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔ رشیدہ تم اندر آ کر منا کو باہر لیجاؤ۔

رشیدہ اندر گئی۔ منا جھولے میں کھیل رہا تھا۔ رشیدہ منا کو لئے باہر آ گئی۔ دس منٹ میں کرانتی چائے بنا کر باہر لے آئی۔ سب نے چائے پی۔ اس کے بعد قمر نے کہا۔

قمر۔ ان گرمیوں کی چھٹیوں میں ہمارا ارادہ پہاڑ جانے کا ہے۔ خیال ہوا کہ تم ہم سب مل کر جائیں۔ ایک مہینہ پہاڑ پر گزاریں گے۔ پھر اتنی لمبی چھٹی ہم کو نہیں ملتی۔ کرانتی نے رام نارائن کی طرف دیکھا۔ رام نارائن خاموش ہو گئے۔ کرانتی نے قمر سے کہا کہ دو روز بعد ہم تم کو اطلاع دیں گے۔ رام نارائن کے پاس پیسوں کا بندوبست تو تھا۔ اس عرصہ میں کوئی دس ہزار روپے رام نارائن نے جمع کر لئے تھے۔ اہم سوال اس وقت من موہنی کا تھا۔ من موہنی کو ساتھ لیجانا مشکل تھا۔ کیونکہ ان کی صحت کچھ ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ ویسے لے بھی جاتے لیکن چار جوان آدمیوں کے ساتھ ایک بوڑھی۔ چلنا مشکل پھرنا مشکل۔ کہیں گر پڑے تو اعتراض۔ اس میں شک نہیں کہ بچہ کو گھر میں ان کے حوالے کر کے باہر گھومنے پھرنے جاتے۔ پھر بھی اگر بڑی بی زیادہ بیمار ہو جائیں تو الٹی آفت۔ مشکل یہ تھی کہ اس مسئلہ کو ان کے سامنے کیسے چھیڑا جائے۔ رام نارائن اور کرانتی نے طے کیا کہ سنہا جی سے اس مسئلہ کو رجوع کریں۔ چنانچہ اسی رات رام نارائن اور کرانتی سنہا جی کے پاس پہنچے۔ اور اپنا مسئلہ پیش کیا۔ سنہا جی۔ نے کہا یہ کونسی مشکل بات ہے میں ٹھیک کر دیتا ہوں۔ سنہا جی اور سنہہ لتا نے من موہنی سے کہا کہ یہ بچے پہاڑ جانا چاہتے ہیں۔ بہت دن سے میرا دل بھی نہیں لگ رہا ہے۔ بہتر ہو گا کہ آپ ہمارے پاس چل کر کچھ دن رہیں۔ پرانی باتوں میں دل لگ جائے گا۔ اور بچے بھی گھوم پھر کر

آ جائیں گے۔ من موہنی نے پہلے تو تکلف کیا۔ سنہہ لتا نے کہا کہ تم تو بیٹے والی ہو تم کو کوئی تکلف نہیں کرنا چاہیئے۔ ہمارا گھر بھی آپ کا ہے۔ پھر جگدیش بھی ہے۔ اس پر من موہنی راضی ہو گئی۔ رام نارائن اور کرانتی نے قمر اور رشیدہ کو خبر دی کہ وہ بھی تیار ہیں۔ مہابلیشور چلیں گے۔ تیسرے ہی دن قمر، رشیدہ۔ رام نارائن اور کرانتی منا کو ساتھ لیکر مہابلیشور روانہ ہو گئے۔ انگریزی ہوٹل میں ٹھیرنے کی سوچے لیکن وہاں پر بہت مہنگا تھا۔ روزانہ فی کس کم از کم تیس روپے دینے پڑتے تھے۔ اس لئے ماڈرن ہندو ہوٹل میں ٹھیرے۔ جہاں روز کے فی کس دس روپے تھے۔ ڈبل بڈ کے بازو بازو دو کمرے ان کو مل گئے۔ ان کے دائیں طرف کے کمرے میں بنگال کے مشہور ناولسٹ چترنجن داس اور نامور انقلاب پسند اجودھیا ناتھ چٹرجی تھے۔ بائیں طرف کے کمرے میں بمبئی کے پروفیسر اکنامکس جی جی ملگاؤں کر ٹھیرے ہوئے تھے۔ چترنجن داس۔ اجودھیا ناتھ چٹرجی اور جی جی ملگاؤنکر تنہا تھے۔ یہ لوگ ہر سال تنہا آیا کرتے تھے۔ کرانتی اور اس کے منا نے ان لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ یہ لوگ صبح کے وقت چہل قدمی سے واپسی پر اکثر منا کو لینے آتے اور گھنٹہ دو گھنٹے ان کے پاس بیٹھ جاتے۔ اس طرح قمر۔ رام نارائن اور ان کی فیملی سے ان کا گہرا میل جول ہو گیا۔ چترنجن داس۔ اجودھیا ناتھ چٹرجی۔ جی جی ملگاؤں کر جو الگ الگ پھرتے تھے۔ آپس میں ملتے نہ تھے۔ ان کی وجہ سے سب ایک جگہ مل کر بیٹھنے لگے۔ یہاں تک کہ کھانے کے وقت بھی ڈائننگ روم میں یہ سب لوگ ایک ہی جگہ کھانے لگے۔ سب کی شام کی چائے کرانتی کے کمرے میں ہوتی۔ ایک دن جب سب لوگ۔ شام میں اکٹھا بیٹھے تھے کرانتی نے کہا۔

کرانتی۔ معاف کرنا آپ اتنے بڑے لوگ جمع ہیں۔ میں کیا منہ کھول سکتی ہوں۔ مجھے آج تک سمجھ میں نہیں آیا کہ کمیونزم اور سوشلزم میں کیا فرق ہے۔

اجودھیا ناتھ چترجی۔ بیٹی کمیونزم دراصل سوشلزم ہی ہے۔ کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ سوشلزم سے مطلب یہ ہے کہ سب انسان برابر ہیں۔ ایک انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کرنے یا فوقیت جتانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ہر شخص کو آزاد رہنے کا حق ہے۔ ہر انسان کو کھانے کھانے اور آگے بڑھنے کے پورے مواقع حاصل ہونے چاہئیں۔ دنیا میں عدم مساوات ہیں۔ ایک انسان دوسرے انسان پر حکومت کرتا ہے۔ ایک انسان بہت دولت مند تو دوسرا بہت غریب۔ ایک کے پاس کھانے کو اتنا زیادہ ہے کہ کھا کر پھینک رہا ہے اور دوسرا بھوکا مر رہا ہے۔ ایک حاکم ہے تو دوسرا محکوم۔ یہ عدم مساوات نہیں رہنی چاہیئے۔ سب کو برابر کھانے کو ملنا چاہیئے۔ اور سب کو برابر آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے مواقع ملنے چاہئیں۔ دولت مند اور صاحب اثر کا بیٹا تو آگے بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ اور غریب کا بیٹا پیچھے ہی رہتا ہے اور پیچھے ہی ڈھکیل دیا جاتا ہے۔ سوشلزم طرزِ حکومت کے ذریعہ یہ عدم مساوات مٹائے جانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کمیونزم کہتا ہے کہ یہ جو اونچے اونچے ہو بیٹھے ہیں اور جو کروڑہا روپے کی دولت دبائے بیٹھے ہیں۔ اور ترقی کے تمام مواقع اپنے قبضہ میں کر بیٹھے ہیں۔ یہ سب چیزیں ان سے چھین لی جانی چاہیئے۔ اس واسطے کہ یہ لوگ خوشی سے ان چیزوں کو نہیں چھوڑیں گے۔ ان سے یہ چیزیں چھین کر ہی لینا پڑے گا۔ پرجا راج ہو۔ پرجا کو چکرورتی پن حاصل ہو۔ سب غاصبوں کو ہٹا کر پرجا کو ہی مالک بنانا چاہیئے۔ سوشلزم بھی یہی کہتا ہے۔ لیکن اس طرح کہ ظلم و زیادتی سے

نہیں مار پیٹ کر نہیں بلکہ قانون بنا کر قانون کے ذریعہ ان کی دولت حکومت اور قوت ان کے ہاتوں سے لے لو۔

کرانتی۔ معاف کرنا مجھے اب بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ روس کی مثال لو۔ فرض کرو روس کی دولت حکومت اور قوت دس ہزار آدمیوں کے ہاتھ میں تھی تو کیا روس کی بیس کروڑ پرجا نے ان دس ہزار کے ہاتھ سے دولت حکومت اور قوت لے لی۔ مجھ کو تو ایسا نظر نہیں آتا۔ زارِ روس کا خاندان تباہ و تاراج کر دیا گیا۔ بڑے بڑے دولت مند امیر و رئیس مٹا دیئے گئے۔ معمولی اور اوسط درجہ کے خاندان کے خاندان نیست و نابود ہو گئے۔ صرف شبہ کی بنا پر کتنوں کو گولی مار دی گئی۔ کتنے کالا پانی بھیجے گئے۔ یہ کون تھے۔ یہ سب پرجا ہی تو تھی۔ ایک پرجا نے دوسرے پرجا کا قلع قمع کیا۔ پھر دولت حکومت اور قوت کس کے ہاتھ میں آئی۔ اتنے ہی دس ہزار کے ہاتھ میں۔ ایک دس ہزار گئے دوسرے دس ہزار ان کی جگہ آ گئے۔ پرجا تو جہاں کی تہاں رہی۔ اب تو یہ کہ کام نہ کرو تو کوڑے کھاؤ۔ کالا پانی جاؤ۔ کھانا ملنے کی گیارنٹی کا غذ پہ لیکن کھانا ملنے کا بھروسہ نہیں۔ سردی سے سکڑ کر مر رہے ہیں۔ کپڑا تن ڈھانکنے کو نہیں۔ لکڑی کو یا جلانے کو نہیں پہلے تو دس ہزار ہی حکومت کرتے تھے۔ اب دس ہزار کے ساتھ دس لاکھ حکومت کرنے کو ہیں اخباری خبروں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ بڑے سے بڑے کی بھی خبر نہیں۔ آج جو بہت بڑے چوٹی کے لیڈر یا عہدہ دار ہیں کل سُولی پر یا جیل خانہ میں راج شاہی دور میں کم از کم ایک راجہ پچیس پچاس برس نہیں تو دس بارہ برس تو حکومت کرتا تھا۔ رعایا کا خیال رکھتا تھا۔ بھیس بدل کر رعایا کی خبر لیتا تھا — کوئی نالائق اور نکما بھی ہوتا تھا۔ لیکن جلد ہی اس کا

قلع قمع ہو جاتا تھا۔ اب یہ جو پارٹی کی حکومت ہوتی ہے تو پارٹی تو مرتی نہیں۔ جتنا جو چاہو ظلم کئے جاؤ۔

رہا سوشیلزم والا معاملہ یہ تو میٹھی چھری معلوم ہوتی ہے۔ قانون بنایا جاگیر لے لیا منصب لے لی۔ زمین لے لی۔ سمجھے کہ بڑا رحم کیا۔ کمیونزم میں تو کم از کم یہ گیارنٹی ہوتی ہے کہ محنت کریں تو روٹی کپڑا ملے گا۔ بال بچوں کو کھانا کپڑا ملے گا تعلیم ملے گی نوکری ملے گی۔ اور آپ کے سوشیلزم میں سب جائداد غیب برائے نام معاوضہ مقرر کیا۔ نہ محنت کی گیارنٹی نہ کھانے کپڑے کی ضمانت نہ دکھ درد کا علاج۔ آرام سے کھاتے کھاتے بڈھے ہو گئے۔ ان سے اب کہتے ہیں کہ محنت کرو۔ کیا محنت کریں اس عمر میں بیل پھاوڑا لینے اور زمین کھودنے سے تو رہے۔ تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا آتا ہے۔ کسی دفتر یا کمپنی میں جائیں تو صورت دیکھتے ہی نو دو گیارہ بول دیتا ہے۔ کوئی رحم دل دو بات کرے تو پوچھتا ہے انگریزی آتی ہے کیا۔ عمر ساری اردو میں گذری۔ اب بڈھے طوطے انگریزی پڑھنے جائیں۔ کیسے ہو سکتا ہے۔ بیمار ہوئے تو دوا ندارد۔ سرکاری دواخانہ گئے تو گھنٹوں کھڑا رہنا۔ پھر دوا کیا پھیکا پانی۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ حال کہ کیفیت بولنے سے پہلے ہی چٹھی لکھدی۔ دو جگہ کھٹاؤنی ہوئی۔ کمپونڈر کے پاس گئے تو رنگین پانی کی شیشی ہاتھ میں پکڑا دی۔ صبح کے ۹ بجے دواخانہ گئے بارہ بجے دوا لیکر واپس ہوئے چار روز دوا پئے بخار جیسے کا ویسا۔ کھانسی حسبِ حال بحال۔ پہلے ایک راجہ اور اس کے کچھ امیر کھا پی لیتے تھے۔ اب تین سو چار سو پانسو راجہ۔ پھر ان کے چیلے بانکے الگ۔ گاؤں گاؤں میں ایک راجہ۔ وہی چالیس کروڑ پر دس ہزار کی حکومت والا معاملہ۔ صرف نام

بدل گئے اور راجاؤں کی تعداد بڑھ گئی۔

اجودھیا ناتھ چٹرجی۔ بیٹی ابھی تم نے اصل سوشیلزم کے ٹھیک مطلب کو نہیں سمجھا۔ دنیا انقلاب سے گذر رہی ہے۔ ایسے وقت کوئی چیز ٹھکانے پر نہیں رہتی۔ راج شاہی اچھی یا بری چلی گئی۔ راجوں مہاراجوں کا زمانہ نہیں رہا۔ نوابوں اور جاگیرداروں کا زمانہ بھی چلا گیا۔ ہندوستان سے ہی نہیں بلکہ دنیا سے چلا گیا۔ اس کے بعد پونجی والوں صنعت کاروں کا زمانہ آیا۔ ان لوگوں نے بھی مان لیا کہ ان کی اپنی نہیں چلے گی۔ چند ملکوں نے ان کو مٹا دیا۔ چند ملکوں میں یہ اب بھی ہیں لیکن زمانہ کی ہوا دیکھ کر اپنی پالیسی بناتے رہتے ہیں۔ اس لئے ہم کہتے ہیں کہ اس وقت دنیا میں میل جول سے رہنے سہنے کا طریقہ ایک سوشیلزم ہی باقی ہے۔ اس کے سوائے دنیا میں اجتماعی زندگی کا کوئی اور حل نہیں ہے۔

کرانتی۔ لیکن دنیا میں کسی مقام پر صحیح معنی میں سوشیلزم ہے بھی۔ دنیا میں شمال سے لے کر جنوب تک مشرق سے لے کر مغرب تک کہیں بھی تو ایسا سوشیلزم نظر نہیں آتا۔ سوشیلزم کا نام اور چند افراد کے ہاتھوں میں سب کچھ۔ ایک پارٹی کے ہاتھ میں سب کچھ۔ کہیں تو دوسری پارٹی کا وجود نہیں۔ کہیں ہے بھی تو صرف دکھاوے کی۔ معاف فرمانا آپ بزرگ ہیں۔ کیا انسان کی فطرت بدل سکتی ہے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ اجی قانون بھی تو یہی لوگ بناتے ہیں جس کے ہاتھ میں لاٹھی ہے۔ نام پارٹی کا اور پارٹی کے چند افراد کے ہاتھ میں حکومت اور قانون سازی سب کچھ۔ حکومت بنتی ہے۔ حصے بقرے ہوتے ہیں۔ اس کو خوش کرو اس کو راضی کرو۔

اجودھیاناتھ چٹرجی۔ نہیں بیٹی۔ تم جو کہہ رہی ہو وہاں ہوتا ہے جہاں ڈھیلی پالیسی اختیار کی جاتی ہے۔ جہاں ملک میں سرفروش سربکف محب وطن نہیں ہوتے۔ ہم انقلاب پسند لوگ ایسی چیزیں برداشت نہیں کرتے ہم فوراً خود غرض اور لٹیروں کا صفایا کر دیتے ہیں۔ ہمارا مقصد اور نصب العین پورے ملک کی بہتری کا ہوتا ہے۔ ہمارے سوشلزم سے مراد پوری سوسائٹی کی بہتری کا ہے۔ کسی خاص جماعت یا گروہ کی نہیں۔ ہم ان تمام عناصر کا صفایا کر دیتے ہیں جو سوسائٹی کی بہتری میں ہارج ہیں اور جو سوسائٹی کو لوٹتے ہیں۔

جی۔ بی۔ ملگاؤں کر۔ چٹرجی صاحب آپ جو فرما رہے ہیں اس حد تک صحیح ہے کہ جب تک جوش اور انقلاب کا دور رہتا ہے آپ جیسا فرما رہے ہیں ہوتا رہتا ہے۔ لیکن جب جوش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ نارمل حالات آ جاتے ہیں سچے سرفروش اور جانثار ختم ہو جاتے ہیں تو وہ اشخاص جو چھپے ہوئے موقع کی تاک میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سرفروشی اور جانثاری کا لبادہ اوڑھے سامنے آ جاتے ہیں۔ اس کے بعد وہی جس کی لاٹھی اس کی بھینس والا معاملہ شروع ہو جاتا ہے۔ انسان بالآخر انسان ہی ہے۔ اس میں اچھی صفات بھی ہیں۔ اور بری خصلتیں بھی۔ وہ ایک طرف دوسروں کی بھلائی کرتا ہے تو دوسری طرف خود اپنے بھائی کو ہڑپ کر جانے سے نہیں رکتا۔ وہ رحمدل بھی ہے تو بے رحم بھی۔ بہر حال انسان جو کچھ بھی ہو وہ اکیلا نہیں رہ سکتا۔ اس کو دوسرے انسانوں کے ساتھ رہنا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ کیسا رہے۔ اس سوال کے حل کے لئے اب تک دنیا میں کئی دستور بنے۔ ہزار ہا برس سے یہ دستور بنتے اور بگڑتے آ رہے ہیں۔ ماں باپ کی حکومت گئی۔ قبیلوں کی حکومت گئی۔ راج شاہی گئی۔ نوابوں، راجاؤں کی حکومت گئی۔ صنعتی دور کا پونجی وادی دور بھی بہت کچھ گیا ہے۔ اب ایک طرف جہاں جہاں پونجی وادی دور بھی تو اس پر اتنے بریک لگ گئے ہیں کہ وہ آسانی سے غریبوں کے حقوق غصب نہیں کر سکتا۔ اور دوسری طرف سوشلزم اور کمیونزم کا دور ہے۔ لیکن یہ دور ایسا ہے جس پر کوئی بریک نہیں نظر آتا۔ ننگے اور بھوکوں کی دنیا۔ روٹی کا ٹکڑا دلانے کا لالچ دلاؤ اور جدھر چاہو موڑ لو۔ آزادی دلانے کا جھانسا دو اور قتل و غارت کرا لو۔ کمیونزم کی دنیا میں تو پونجی وادی کا سوال ہی نہیں۔ اگر کچھ ہے بھی تو اپنے کو پونجی وادی کیوں بولیں گے۔ اور جب اسٹیٹ کی پونجی ہی اپنی پونجی ہے۔ اپنے کو اس پر پورا اقتدار ہے تو پھر اپنے کو پونجی وادی کہہ کر رسوا ہونے سے کیا فائدہ۔ سوشلزم ننگے بھوکوں کی دنیا میں بہت مقبول ہے اور جہاں ابھی کمیونزم پورا پھیل نہیں گیا ہے کچھ کچھ پونجی وادی آٹے میں نمک کے برابر نظر آتے ہیں۔ وہ اس وجہ سے کہ یہاں پر قانون کے ذریعہ مساوات لانے کی کوشش ہے۔ رفتہ رفتہ۔ دھیرے دھیرے۔ اس دور میں بھی جیسا کہ انسان کی خصلت ہے۔ پونجی وادی بن رہے ہیں۔ لیکن نام بدل کر بھیس بدل کر۔ یہ اپنے کو دیس بھگت کہتے ہیں۔ لیکن ان کے بیانک بیلنس کا کوئی پتہ نہیں۔ ان کی جائداد کا کوئی پتہ نہیں۔ پونجی وادی دور میں تو علانیہ اور باضابطہ پونجی وادی کہتے اور ویسے عمل کرتے ہیں اور قانون کی بھی ان پر گرفت رہتی ہے۔ لیکن ان چھپے ہوئے پونجی وادیوں کو کس طرح پکڑا جائے۔ قانون ان پر ہاتھ ڈال نہیں سکتا۔

چترنجن داس ۔ بھئی یہ قصہ چھوڑو کوئی اچھی مزے مزے کی باتیں کرو ۔ یہ کبھی ختم ہونے والا قصہ نہیں ہے ۔ دنیا جب تک ہے ۔ ایسے کئی ازم آئیں گے اور جائیں گے ۔ ہم کو کسی ازم سے مطلب نہیں ۔ موسم کتنا سہانا ہے ۔ ہلکی ہلکی برکھا ہو رہی ہے ۔ دیکھو سامنے صنوبر کے درخت کتنے بھلے معلوم ہو رہے ہیں ۔ وہ دیکھو سامنے چمن میں پھول کیسے رنگ برنگے کھلے ہیں ۔ ہریالی پر بارش کی بوندیں کتنی خوب صورت ہیں ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ موتیوں کا فرش ہے ۔ وہ دیکھو ٹھنڈی ہوا چلی ۔ کیسی سردی ہو رہی ہے ۔ اے کرانتی منا کو جلدی سوئٹر پہنا دو ۔ ہاں بیٹی کرانتی ۔ اس وقت تم کہو کیا ہونا چاہیئے ۔ ہمارا دل تو تمہارے ہاتھ کی چار پینا چاہتا ہے ۔

کرانتی ۔ اچھا چاچی میں ابھی چار تیار کرتی ہوں ۔ رشیدہ قمر اور یہ ملکر پکوڑوں کی تیاری شروع کریں ۔

رشیدہ ۔ قمر صاحب اور رام نارائن بھیا اپنی جگہ تشریف رکھیں اگر یہ حضرات زحمت فرماویں تو آپ سب کو کچا پکا بیسن کھانا پڑے گا ۔ چولھا الگ اوندھا ہوگا ۔ میں خود سب دو منٹ میں تیار کئے دیتی ہوں ۔

چترنجن داس منا کو گود میں لے کر کھیلتے رہے ۔ پندرہ منٹ میں چار بھی تیار ہوگئی اور پکوڑے بھی گرم گرم میز پر آ گئے ۔

جی ۔ بی ملگاؤں کر ۔ بات کو اس طرح ختم کر دینے سے کیا فائدہ جب ہم لوگ اپنے کو انسان سمجھتے ہیں تو ہماری سماجی زندگی کا کوئی حل ہونا چاہیئے ۔ دنیا اس وقت ایک پریشانی کے دور سے گزر رہی ہے ۔

رشی منیوں نے سدھانت بنائے فلسفہ حیات مرتب کیا جو کم از کم پانچ ہزار برس تو چالو رہے اور اب بھی ان کی بنیادی باتوں سے کوئی ہٹ نہیں سکتا ۔ سو دو سو برس سے ان سدھانتوں کو موجودہ زمانہ کے لئے ناکافی سمجھا جا رہا ہے ۔ اب ہم کوئی ایسا نظام بنانا چاہیئے کہ دنیا کم از کم سو سال تو ٹھیک طور پر چلے ۔ ہر طرف مہلک سے مہلک ہتیاروں کے انبار لگ رہے ہیں ۔ ہر قوم دوسری قوم کو شبہ کی نظر سے دیکھ رہی ہے ۔ جب ایک قوم کا دوسری قوم پر بھروسہ نہیں تو ایک انسان کا دوسرے انسان پر کیا بھروسہ ہوگا ۔ جتنی دولت انسان کی بھلائی اور اس کی ترقی میں صرف ہو سکتی ہے ۔ اس کا کثیر حصہ مہلک آلات کی تیاری میں صرف ہو رہا ہے ۔ نوجوان جوشیلے لوگ بنی بنائی عمارتوں کو توڑ پھوڑ دینا چاہتے ہیں ۔ لیکن ان کی جگہ کونسی عمارتیں بنائیں گے ۔ ان کا ایک موہوم نقشہ ان کی ذہن میں ہے اور بس ۔ لے دے کر وہ کمیونزم کی طرف آتے ہیں اور ذرا سلیقہ مند ہیں تو سوشیلزم کا نام لیتے لیکن دونوں بھی ہیں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ۔

یاد رکھئے کہ ہماری زندگی کا کوئی فلسفہ کوئی اصول ہونا چاہیئے ۔ خواہ وہ انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی زندگی ۔ اس فلسفہ اور اصول کو ہمیشہ عوام نہیں سمجھ سکتے ۔ یہ فلسفہ اور اصول خاص دماغوں سے ہی نکلتے ہیں ۔ خود سوشیلزم ایک دماغ کی پیداوار ہے ۔ عوام کو تعلیم کے ذریعہ اس کے حسن و قبح سے واقف کرایا جاتا ہے ۔ انسان میں خود غرضی کا مادہ بھی ہے اور قربانی کا جذبہ بھی ۔ خود غرضی کے مادہ کو اگر آپ ابھارو گے تو انسان ہمیشہ میرا حق میرا حق بولتا رہے گا ۔

اور لوٹتا رہے گا۔ قانون بناؤ گے تو قانون کے ذریعہ ہی لوٹے گا اور۔ اگر قانون نہ ہو تو جس طرح چاہیئے۔ اب اتنے قانون بنے ہیں پھر کیا لوٹ نہیں چل رہی ہے۔ برابر چل رہی ہے۔ قانون بنے تو لٹیرے کو اور زیادہ لوٹنا پڑتا ہے کیونکہ ایسے لوگوں سے مدد لینی پڑتی ہے جو قانون کی زد سے بچا سکیں۔ اور اس کے لئے ان کی جیب گرم کرنی پڑتی ہے۔ اس کے برخلاف اگر آپ انسان میں ایثار کے جذبہ کو ابھاریں تو حق طلبی کے بجائے خدمت گزاری کا جذبہ ابھرے گا۔

انسان میں جو خود غرضی اور لوٹ کھسوٹ کا جذبہ ہے اس کو دو طرح سے اب تک ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ ایک تو یہ کہ آپ کو ڈرا کر کہ تمہارا اس جنم کے بعد دوسرا جنم بھی ہے۔ اگر اس جنم میں تم اس طرح کے پاپ کرو گے تو مرنے کے بعد تم کو طرح طرح کے عذاب دیئے جائیں گے۔ یہ ڈر اب لوگوں میں کم ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن پھر بھی ہے۔ مذہب کا جذبہ اب بھی لوگوں میں باقی ہے۔ FAITH ایک قدرتی چیز ہے۔ جس طرح انسان کی اور قوتیں ہیں یہ بھی ایک قوت ہے۔ اس کو بڑھایا بھی جا سکتا ہے اور گھٹایا بھی جا سکتا ہے۔ بہت کم لوگ ہیں جن میں یہ جذبہ مفقود ہوگا۔ دوسرا طریقہ لوٹ کھسوٹ کے جذبہ کو ختم کرنے کا قانون ہے۔ قانون دنیا میں عرصہ سے ہے۔ ہزاروں لاکھوں لوگ سزا پا چکے ہیں۔ پھانسی کی سزائیں بھی دی گئیں لیکن یہ جذبہ گیا نہیں۔ بس ایک حد تک قانون سے روک تھام ہوتی ہے۔ تیسرا طریقہ جو کمیونزم میں لوٹ کھسوٹ کو روکنے کا ہے وہ بہت حد تک کامیاب ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس کو صحیح طریقہ سے عمل کیا جائے وہ یہ کہ حکومت اس امر کا یقین دلائے کہ ہر

شخص سے کام اس کے حسبِ استطاعت لیا جائے گا اور معاوضہ حسبِ ضرورت دیا جائے گا۔ ہر شخص کی جائداد کی وارث حکومت ہوگی۔ اس کے بال بچوں کی پرورش، تعلیم اور روزگار کی حکومت ذمہ دار ہوگی۔ ایسی صورت میں اگر کوئی شخص لوٹ کھسوٹ کرے گا بھی تو اپنی زندگی کی حد تک نہ تو وہ کوئی جائداد چھوڑنے کی خواہش رکھے گا اور نہ اپنی اولاد کی اس کو فکر ہوگی۔ لیکن کسی حکومت کا ایسی ذمہ داری قبول کرنا مشکل نظر آتا ہے۔ کمیونسٹ ممالک ایک حد تک ایسی ذمہ داری قبول کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن وہ اس میں پوری طرح کامیاب نظر نہیں آتے۔ دوسرے یہ کہ اس طریقہ سے انسان میں پیار اور محبت خصوصاً اولاد سے پیار اور محبت بیوی سے پیار اور محبت کا جذبہ کم ہوتا جاتا ہے۔ اور ایثار کا جذبہ بھی باقی نہیں رہتا۔ انسان بالکلیہ ایک مشین بن جاتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ لوٹ کھسوٹ کا جذبہ نہ تو مٹا دیا جا سکتا ہے اور نہ اس کو بے لگام چھوڑ دیا جا سکتا ہے۔ قانون اور مذہب دونوں ملکر حدود میں رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سے ہٹ کر قانونِ قدرت بھی اپنی جگہ عمل کرتا رہتا ہے۔ جہاں یہ جذبہ بہت زیادہ ہوا بہت لوٹ کھسوٹ شروع ہوئی کہ انقلاب آیا۔ سب کو بہا لے گیا۔ پھر حالات نارمل پر آئے۔ پھر لوٹ کھسوٹ شروع ہوئی۔ پھر انقلاب آیا۔ اس طرح سلسلہ جاری رہتا ہے۔ لہٰذا اجتماعی فلسفہ حیات قربانی اور ایثار پر مبنی ہونا چاہیئے۔ ہمارے دستور کی بنیاد قربانی اور ایثار پر مبنی ہونی چاہیئے۔ ہمارے دستور کی ہر دفعہ میں اس کی جھلک ہونی چاہیئے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ قانون کے ذریعہ لوگوں کو ایثار اور قربانی پر مجبور کیا جائے۔

بلکہ دستور کی پالیسی یہ ہونی چاہیئے۔ دوسرے اخلاقی پالیسی یہ ہونی چاہیئے کہ سوسائٹی فرد کی حفاظت کرے۔ قانون کے ذریعہ فرد کو سوسائٹی پر قربان نہیں کیا جانا چاہیئے۔ بلکہ فرد اگر حق اور صداقت پر ہے تو سوسائٹی اس کے حق کی حفاظت کرے۔ تیسرے مینارٹی اور میجارٹی کا تصور ہی نہیں ہونا چاہیئے۔ میجارٹی اور مینارٹی کا خیال اس وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ چند لوگ دوسرے چند لوگوں پر چھا جانا اور ان کی زندگی کے مواقع محدود کر دینا چاہتے ہیں۔ اور یہ چیز حکومت کی پالیسی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ جہاں کسی چیز کے بٹوارے کی نوبت آتی ہے تو پہلے تو انسان انفرادی طور پر اس کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جب انفرادی طور پر حاصل نہیں کر سکتا۔ تو جماعت کا سہارا لیتا ہے۔ ان ہی وجوہ سے کہیں مذہب کی بنا پر کہیں نسل کی بنا پر کہیں فرقوں کی بنا پر کہیں عورت مرد کے فرق کے لحاظ سے اور کچھ نہیں تو پس ماندگی کا حیلہ لیکر مینارٹی میجارٹی کا سوال اٹھایا جاتا ہے۔ حالانکہ مینارٹی میں بھی انسان ہیں اور میجارٹی میں بھی انسان ہیں۔ اور ہر انسان کو بہ حیثیت انسان اس کی ضرورت کی چیزیں ملنی چاہیئے۔

اب تو اسکول اور کالج میں داخلہ اور سرکاری ملازمت کے لئے درجہ کامیابی کو دیکھا جاتا ہے۔ حالانکہ جب کسی طالب علم نے ایک امتحان کامیاب کیا ہے تو اس کو اونچے درجہ میں داخلہ ملنا ہی چاہیئے خواہ وہ کسی فرقہ یا جماعت کا ہو خواہ کسی درجہ میں کامیاب ہو اسی طرح سرکاری ملازمت میں داخلہ کے لئے بھی لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ سو کامیاب طلبا میں دس بیس کو داخلہ ملتا ہے اور باقی محروم۔ ہراسان و سرگرداں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بے چینی گڑبڑ اور قانون شکنی

نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ بعض کالجوں میں تو داخلہ کے لئے پانچ ہزار روپے دس ہزار روپے دو تو داخلہ ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح جن کے ماں باپ دولت مند ہیں وہ مستقلاً غریبوں پر سبقت لے جاتے ہیں۔

ایک اور چیز قابل غور یہ ہے کہ جو شخص جس شعبۂ زندگی کا اہل ہے اس طرف نہیں جاتا بلکہ اس شعبہ کو اختیار کرنا چاہتا ہے جس میں زیادہ سے زیادہ تنخواہ مل سکتی ہے۔

اگر ہم ایثار کے جذبہ کو ابھارنے کے ساتھ ساتھ۔ تنخواہوں کے فرق کو کم کردیں تو بہت بڑی حد تک موجودہ انتشار کم ہوگا۔ سرکاری ملازمت کی طرف آدمی اس لئے جاتا ہے کہ خانگی ملازمت کے دائرے تنگ ہوتے جارہے ہیں۔ حالانکہ سرکاری ملازمت میں ایک شخص کی زندگی تلخی ہوجاتی ہے۔ ایک اور وجہ اس خرابی کی یہ ہے کہ ہم سرکاری دائرہ کو بڑھاتے جارہے ہیں۔ اور خانگی دائروں کو کم کرتے جارہے ہیں۔ سرکاری دائرہ ضرور بڑھایئے۔ لیکن اپنی صلاحیت کے مطابق۔ اگر سرکار ہر شخص کو ملازمت دے اور ہر طالب علم کو داخلہ دے تو بخوشی سرکاری دائرے بڑھائے جاسکتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوسکتا۔

امتحانات میں کامیابی کے درجے بھی مقرر نہیں ہونا چاہیئے۔ تعلیم میں سب سے بڑی خرابی امتحانات کی کامیابی کے درجے مقرر ہونے سے ہے۔ معلوم نہیں یہ کہاں کی تقلید ہمارے پاس چلی آرہی ہے۔ امتحان میں یا تو پاس ہو یا فیل اور بس۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اور امتحان کے وقت موضوع امتحان کے علاوہ طالب علم میں ایثار کے جذبہ کی بھی جانچ ہونی چاہیئے اور

اس کے بھی نمبر دیے جانے چاہیئے. کیونکہ ایثار کا جذبہ علم کا صحیح نچوڑ ہوتا ہے۔ جس تعلیم نے ایثار کا جذبہ پیدا نہیں کیا وہ صحیح تعلیم ہی نہیں۔ اور اس کے لئے طالب علم کا استاد ذمہ دار ہونا چاہیئے۔ ایک امر قابل غور یہ ہے کہ ہماری ضروریات کو بڑھا دیا جا رہا ہے اور ہماری زندگیوں میں تصنع پیدا کر دیا گیا ہے۔ اور اس کو ترقی کا نشان سمجھا جاتا ہے حالانکہ ہماری ضروریات ہماری حد پیداوار کے اندر ہونا چاہیئے۔ مثال کے طور پر لباس کو لو۔ ہمارے ملک کی آب و ہوا کے لحاظ سے ہم کو اتنے لباس کی ضرورت نہیں ہے جتنا کہ ہم استعمال کرتے ہیں۔ طرفہ یہ ہے کہ جو لوگ لباس نہیں پہنتے اور جن کو زیادہ لباس کی ضرورت نہیں ان کو بھی لباس کی عادت ڈالی جا رہی ہے۔ چاء کی ضرورت نہیں چاء پلائی جا رہی ہے۔ گاؤں میں صرف چتے کا چٹہ پیا جاتا تھا۔ بہت ہوا بیڑی۔ اب گاؤں گاؤں میں سگریٹ پھیل رہا ہے۔ بے شک گاؤں میں صفائی کرو۔ پینے کا صاف پانی دو۔ بیماریاں دور کرو۔ دیسی سستی ادویہ سے جو مجرب ہیں اور زود اثر بھی علاج ہونے دو۔ ضرورت پر نئی ادویہ بھی استعمال ہوں۔ لیکن نقلی ادویہ گاؤں گاؤں پھیل رہی ہیں۔ اس سے رعایا اور حکومت کا روپیہ ضائع ہو رہا ہے۔ رعایا میں تعلیم پھیلاؤ لیکن صحیح تعلیم اور صحیح استاد کے ذریعہ۔ کوئی دولت مند بننا چاہتا ہے تو بننے دو۔ آخر اس کی دولت جائیگی کہاں۔ اسکی دولت دوسروں کے ہی کام آئے گی۔ اس کو خرچ کرنا ہی پڑے گا۔ گاؤں گاؤں چاول، جوار، گیہوں، دودھ، گھی، تیل ملنے دو۔ اچھی سبزیاں اچھا گوشت، اچھے مرغی انڈے ملنے دو۔ بجلی کی روشنی سے زیادہ ان

چیزوں کی ضرورت ہے۔ گاؤں سے ملیریا دور کرو۔ نارو کی بیماری دور کرو۔ فیل پا دور کرو۔ پیٹ کی بیماریاں دور کرو۔ گاؤں کے آدمی کو اسی گاؤں میں نوکری دو۔ ایک گاؤں کے آدمی کا دوسرے گاؤں میں بلا وجہ تبادلہ مت کرو۔ ایسے تبادلوں میں کوئی اڈمنسٹریٹیو خوبی نہیں ہے۔ اگر وہ بے ایمان ہے تو کہیں بھی جائے بے ایمانی کرے گا۔ اس میں حکومت کا خرچہ بھی کم اور وہ بھی اپنے بال بچوں کے ساتھ اطمینان سے رہے گا۔ اس کے بال بچوں کی تعلیم تربیت خراب نہیں ہوگی۔ اگر سرکاری ملازم سے ایمانداری اور وفاداری کی امید کی جاتی ہے تو اس کے بال بچوں کی پرورش تعلیم و تربیت اور ان کو ملازمت یا کوئی اور روزگار ملنے کا بھی حکومت کو خیال ہونا چاہیئے۔ ایک سرکاری ملازم اپنی عمر کا بہترین حصہ سرکاری ملازمت میں صرف کر دیتا ہے۔ ناکارہ ہو جاتا ہے۔ سرکاری ملازمت سے نکلنے کے بعد وہ بہت کم صورتوں میں کسی کام کا رہتا ہے۔ بیشک سرکار وظیفہ دیتی ہے لیکن اس وظیفہ سے اسکی ضروریات پوری نہیں ہوتیں۔ جب وظیفہ کی نوبت آتی ہے تو بال بچے بڑے ہو جاتے ہیں۔ خرچہ بڑھ جاتا ہے۔ اور تنخواہ نصف اور اس سے بھی کم ہو جاتی ہے۔ پھر اس کی تنخواہ کے لحاظ سے اس کا ایک معیار زندگی ہوتا ہے۔ اگر حکومت ان چیزوں کا خیال نہ کرے۔ ملازم کے بال بچوں کو ہوا پر چھوڑ دے تو خود ملازم تو ایسا نہیں کر سکتا۔ اس کو تو انتظام کرنا ہی پڑتا ہے۔ وہ یہ انتظام کیا کر سکتا ہے۔ آپ ہی سمجھ لیں فطرت کے خلاف قانون نہیں چل سکتا۔ خواہ رشوت خوری روکنے کے آپ کتنے قانون بنائیں۔ وہ لوگ جو سیدھے سادھے ہیں وہ تو ڈر جاتے ہیں۔ لیکن ہوشیاروں کو کوئی

قانون نہیں روک سکتا۔ جس طرح اور چیزیں خریدی جاتی ہیں۔ اسی طرح ایمانداری اور وفاداری کو بھی کئی طریقوں سے خریدنا پڑتا ہے۔ انگریزوں نے ہندوستان پر حکومت ہندوستانیوں کے ذریعہ کی۔ اور وہ اس طرح کہ انھوں نے ہندوستانیوں کی ایمانداری و وفاداری اپنے حسنِ سلوک سے خریدی۔ معمولی کسی خانگی کمپنی میں کوئی ملازم ہو اور وہ ملازم ایماندار اور وفادار رہے تو خانگی کمپنی اس کے بیوی بچوں کا خیال کرتی ہے۔ اس کے بچوں کو جہاں تک ہو سکے اپنے پاس نوکری دیتی ہے۔ یہ معمولی انسانی فطرت کی بات ہے۔ سرکاری ملازمت میں نہ صرف ایمانداری بلکہ اس سے زیادہ وفاداری کی بھی ضرورت ہے۔ ورنہ حکومت کی تمام مشنری کھوکھلی ہو جائے۔ اگر آپ ایک کلکٹر کے بیٹے کو یہ کہیں کہ اس کو اس حکومت میں کوئی جگہ نہیں ہے تو پھر آپ اس کلکٹر سے کس طرح وفاداری کی امید رکھ سکتے ہیں۔ قانون کے ڈر سے ممکن ہے کہ وہ ایماندار رہے۔ لیکن آپ اس کو وفادار نہیں بنا سکتے۔ اس لئے کہ وفاداری تو وقت پڑنے پر معلوم ہوتی ہے۔ چھوٹے موٹے سرکاری ملازم کی مثال نہیں دے رہا ہوں ایک کلکٹر کی مثال دے رہا ہوں۔ جب کوئی شخص کلکٹری تک پہنچتا ہے تو اس کو اوسط چار بچے ہوتے ہیں۔ نو سو روپے تک تنخواہ ہو جاتی ہے۔ اب اس نو سو روپے میں آج کل کے لحاظ سے کم از کم دو سو روپے ماہانہ تو مکان کے کرایہ میں جاتے ہیں یا اگر اس نے قرضہ مکان بنانے کے لئے لیا ہے تو ماہانہ تقریباً دو سو روپے قرضہ کی ادائی میں جاتے ہیں۔ موٹر کار کے قرضہ میں تقریباً دو سو روپے ماہانہ کٹ جاتے ہیں۔ ایک سو روپے ماہانہ بیمہ پالیسی کے

تحت جائیں گے۔ نو سو روپے ماہوار پر کوئی پچیس روپیہ ماہانہ انکم ٹکس ہوگا۔ اس طرح ہاتھ میں ماہانہ تین سو روپے آئے۔ اس میں گھر پر ایک خانگی ملازم ایک پکانے والا۔ بچوں کی اعلیٰ تعلیم۔ ان کا لباس ان کا کھانا پینا دعوت مدارات موٹر کا پٹرول۔ موٹر ڈرائیور۔ اگر چپراسی سے بھی کام لیں تو اس کو کچھ نہ کچھ دینا پڑتا ہے۔ موٹر کی ترمیم اوس کا ٹکس اور فیس رجسٹری۔ اس کا انشورنس پھر دکھ بیماری اپنی اور بال بچوں کی۔

آخر یہ سب خرچہ تین سو روپے میں کیسے ہو۔ اس عرصہ میں ایک یا دو لڑکیاں شادی کے قابل بھی ہو جاتی ہیں۔ انکی شادی کے اخراجات۔ پھر کلکٹر کی بیٹیاں بالکل معمولی طریقہ سے تو شادی ہونے سے رہیں۔ دروکشنا الگ۔ لڑکی کو کچھ تو زیور اور پارچہ دیا جائے گا۔ کوئی لڑکا کلکٹر کی بیٹی سے شادی کرتا ہے تو کچھ تو امید لے کر آتا ہے۔ قانون انسداد جہیز کو لے کر بیٹھیں تو کسی لڑکی کی شادی ہی نہ ہو۔ کوئی علانیہ تو مانگے گا نہیں لیکن دل را بہ دل ہست تو ہو گا ہی۔ کچھ نہیں تو اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر ملک بھیجنے کی تجویز۔ دولہا دلہن دونوں بھی ساتھ جائیں۔ اس کے بعد لڑکوں کی اعلیٰ تعلیم ہے۔ کلکٹر کا بیٹا چپراسی ہونے سے تو رہا۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے بہت اونچے نمبر ہونا چاہیئے۔ سب تو اونچے نمبر نہیں لیتے۔ اونچے نمبر لانے کی تجویز۔ کس طرح کامیاب ہو۔ کچھ نہ کچھ تو کلکٹری کے اثرات کو کام میں لانا ہے۔ اس دنیا میں اِس ہاتھ دو اُس ہاتھ لو۔ کچھ تو لین دین ہونا ہی پڑے گا۔ روپے پیسے کا نہیں تو کسی اور طریقہ سے۔ کونسا قانون انسدادِ رشوت ستانی اس کی اصلاح کر سکے گا۔ کس طرح قانونِ قدرت کے بہاؤ کو روکا جا سکتا ہے۔

یہ تو سرکاری ملازم کی بات ہوئی۔ اگر آپ اسمبلی کی ممبری حاصل کرنے کا حال دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ایک غریب امیدوار کتنا زیر بار ہو جاتا ہے۔ دولت مند لوگ تو لاکھوں خرچ کر سکتے ہیں۔ ان کا کیا مقابلہ۔ غریب آدمی کا حال تو پوچھو ہی نہیں لیکن اگر ایک متوسط طبقہ کا آدمی اسمبلی کے انتخاب کیلئے کھڑا ہے تو پانچ ہزار دس ہزار تو آسانی سے خرچ ہو جاتے ہیں۔ اب یہ پانچ دس ہزار آئیں کہاں سے۔ امیدوار یا تو کوئی چھوٹا بیوپاری ہوگا یا زراعت پیشہ۔ بیوپار بند کر کے یا زمین رہن رکھ کر منتخب ہو بھی گیا تو پھر یہ پانچ دس ہزار کا قرضہ کس طرح ادا کرے۔ بال بچوں کو کس طرح پالے۔ اسمبلی کی نشست کوئی روپیہ بنانے کی مشین تو نہیں ہے کہ اسمبلی میں گئے اور روپیہ بنانا شروع کیا۔ اسمبلی سے ماہانہ دو سو روپے جو ملتے ہیں وہ کھانے پینے گھر کے کرایہ اور خرچ سواری کو ہی کافی نہیں ہوتے۔ پھر اسمبلی سے دست بردار ہوئے تو نئی دنیا میں آئے یوماً جدید رزقاً جدید۔ سب کو تو پارلیمنٹ یا اسمبلی میں منسٹری نہیں ملتی۔ جن جن کو ملی بھی تو تنخواہ اتنی کم کہ ان کی حیثیت کے لحاظ سے کچھ نہیں بچتا۔ یہ اور بات ہے کہ دوسرے طریقوں سے کچھ کما لو۔ سرکاری ملازم کو تو تنخواہ اور پنشن ملتا ہے۔ یہاں تو پانچ سال بعد برخاست جہاں سے آئے تھے وہیں لوٹ جانا ہے۔ ڈاکٹر تھے تو ڈاکٹری گئی۔ وکیل تھے تو وکالت گئی۔ بیوپاری تھے تو بیوپار چوپٹ ہوا۔ پانچ سال کے بعد بھی کوشش ہوتی ہے کہ دوبارہ ٹکٹ ملے۔ اگر ٹکٹ نہیں ملا تو دن میں تارے نظر آنے لگتے ہیں۔

چترنجن داس ناولسٹ۔ اجی ملگاؤں کر جی۔ یہ گورکھ دھندا تو

کبھی ختم ہونے والا نہیں۔

سری کرشن پرماتما نے بھگوت گیتا میں سب گیان دیا۔ نشکام کرنا بتلایا۔ ڈیوٹی ہی سب کچھ کہا۔ لیکن انسان آخر انسان ہی ہے۔

ملگاؤں کر۔ اجی جناب جب سے مغربی حکومتوں نے اپنا حق اپنا حق کہنا شروع کیا۔ جب سے ہم نے مغربی دستور پڑھا ہے اور آزادی کے لئے مغربی طرز کی جدوجہد شروع کی۔ میرا حق میرا حق کا نعرہ اٹھ کھڑا ہوا۔ مغل بادشاہوں کے زمانہ میں بھی تو یہ کیفیت نہ تھی۔ مہابھارت رامائن اور گیتا کی تعلیم کو اس زمانہ میں بھی عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ خود بادشاہ اپنے کو امین اور حکومت کو خدا کی امانت سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ اورنگ زیب جس کو اکثر مورخین نے بدنام کر رکھا ہے۔ اپنے محنت کی کمائی پر اکتفا کرتا تھا اور حکومت کے روپے کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔ مغل بادشاہوں کے زمانہ میں بھی غرض پر زور دیا جاتا تھا۔ ایک مسکین سے مسکین اور غریب سے غریب کے حق کی حفاظت کیلئے حکومت کی پوری مشنری متحرک ہو جاتی تھی۔

چترنجن داس ناولسٹ۔ اچھا اب یہ قصہ بند کرو۔ کچھ مزے مزے کی باتیں ہونے دو۔ دیکھو منا کھیل رہا ہے اسوقت تو کوئی اچھا گانا ہو جائے۔ کرانتی اور رشیدہ امید ہے کہ کچھ سنائیں گے۔ قسم اور رام نارائن نے بھی بہت ٹھیک کہا۔

کرانتی۔ مجھے تو کچھ گانا نہیں آتا۔

رشیدہ۔ میں نے تو گانے کی صورت نہیں دیکھی۔

قمر اور رام نارائن۔ اچھا تو آپ جس طرح چاہیں اُلا پیں۔ بزرگوں کے کہنے کو آپ لوگ ٹال نہیں سکتے۔ اس پر کرانتی نے مالکوس کی ایک دھن سنادی۔ (۹) بج چکے تھے۔ رات کے کھانے کا وقت ہو گیا۔ سب مل کر ڈائننگ ہال کی طرف چلے گئے۔

۸

پنڈت برج لال ویاس کی دعوت کے بعد سے جگدیش کا پنڈت ہند کشور کے پاس آنا جانا بڑھ گیا تھا۔ نند کشور اکثر خود آکر جگدیش کو اپنے گھر لے جایا کرتا تھا۔ اور خوب بحثیں ہوتیں۔ پنڈت ہند کشور کی بیٹی دمینتی بھی اس بحث میں کبھی کبھی شریک ہو جاتی۔ دمینتی سنسکرت کی اسکالر تھی۔ اور سوشیالوجی لیکر بی اے کیا تھا۔ سن اس کا کوئی اکیس سال کا ہوگا۔ سر پر گھنے کالے ملائم بال بال کھولے تو ایڑھی تک پہنچتے۔ پیشانی نہایت کشادہ۔ ستواں ناک۔ ابرو بالکل کماندار۔ کان بالکل پتلے اور لوئی کے پاس نہایت خوبصورت خم لئے ہوئے۔ آنکھیں بڑی بڑی سفید لیکن سرخی مائل اور ان میں پتلی بالکل گہری کالی۔ ٹھوڑی کے بیچ میں ایک چھوٹا سا گڑھا۔ گردن لانبی اور عین سیدھے کان کی لوئی کے نیچے ایک تل۔ پورا جسم نہایت سڈول۔ کافی اونچی لیکن بد نما نہیں کیونکہ جسم پورا ابھرا ہوا تھا۔ ہاتھ کی انگلیاں لانبی۔ اور نوکدار۔ ایسا معلوم ہوتا کہ کسی فن کار کی انگلیاں ہیں۔ جگدیش کی باتوں پر بہت ریجھی ہوئی تھی۔ اس کے بشرے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جگدیش کو دنیا میں وہ سچا مالک کا سیوک اور آئندہ کا رہنما سمجھتی ہے۔ نند کشور جگدیش اور دمینتی میں اب بالکل بے تکلفی ہو گئی تھی۔ اکثر نند کشور جگدیش کو کھینچ کر

اپنے مکان لایا کرتا۔ کبھی آٹھ دس دن مسلسل اگر جگدیش نند کشور کے پاس نہ آئے یا نہ لایا جائے تو دمینتی میں وہ شگفتگی اور تازگی نظر نہ آتی جو اس کا خاصہ تھا۔ حالانکہ دمینتی اس کیفیت کو بہت چھپانے کی کوشش کرتی۔ بلکہ وہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتی کہ وہ بہت زیادہ ہشاش بشاش ہے۔ لیکن اصلی بشاشت اور بناوٹی بشاشت کا فرق صاف نظر آجاتا۔ نند کشور کو اس حالت کا فوراً اندازہ ہو جاتا اور جہاں تک ہو سکے جگدیش کو پکڑ لاتا۔ بہت دنوں کے بعد جب جگدیش اس طرح آتا یا لایا جاتا تو نند کشور کے گھر کی رونق ہی بدل جاتی باوجود اس کے جگدیش اور دمینتی میں کافی فاصلہ تھا۔ جگدیش ایک یار باش اور منچلا جوان تھا۔ خوش گپیوں اور بحثا بحثی میں اس قدر ڈوب جاتا کہ ایسا لگتا کہ اس کے پاس سنجیدگی سے کسی بات کو سوچنے کا موقع ہی نہیں ہے۔ کرانتی، ریحانہ اور نمر سے وقت بے وقت بحثا بحثی کرتے اس کو گویا یہ عادت پڑ گئی تھی۔ یا پھر کوئی موقع ملا تو شطرنج پر جم جاتا۔ لیکن جگدیش اور دمینتی میں یہ فاصلہ بہت دن باقی نہیں رہا۔ جگدیش کو اکثر یہ خیال رہتا کہ پچھلے دن بحث جو ادھوری رہ گئی تھی اور دمینتی مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ اس کی تشفی کے لئے اس کو نند کشور کے پاس جانا چاہیے۔ پنڈت ہند کشور اور انکی شریمتی جی بھی جگدیش کے چٹکلے پن پر ہنستے رہتے۔ ان بچوں کی محفل میں اگر جگدیش نہ ہو تو وہ بھی سونا سونا محسوس کرتے۔ بات بڑھتی گئی۔ جگدیش کو اب ایسا معلوم ہونے لگا کہ وہ کھویا کھویا سا ہے۔ گھر میں کھانے پینے کو سب کچھ۔ سنہا جی نے اب اس کو لمبریڈا دلوا دی تھی۔ تاریخ میں ایم اے کر لیا تھا۔ سنہا جی چاہتے تھے کہ وہ ایل ایل بی کرے تاکہ اس کو وکالت میں لگا دیا جائے۔ تقریر کا دھنی تھا۔ جس محفل میں بیٹھا اس کو گرم کر دیتا تھا۔ سنہا جی نے اپنے قدیم ملاقاتی

بچوں سے اس کا تعارف کرا دیا تھا۔ جگدیش کے لئے صرف پہلا تعارف کافی تھا۔ اس کے بعد لوگ ہی اس کی طرف کھینچ آتے تھے۔ پہلے جگدیش نے یہ سمجھا کہ کرانتی کے چلے جانے سے وہ اپنے کو کھویا کھویا محسوس کر رہا ہے۔ لیکن کرانتی میکے آئے بھی تو تھوڑے دن ہنگامہ آرائی ہوتی لیکن پھر بھی کھویا کھویا پن وہ اندر ہی اندر محسوس کرتا۔ البتہ جب وہ نند کشور کے گھر جاتا تو محسوس کرتا کہ اس کی کوئی کھوئی چیز مل گئی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ جب جگدیش نند کشور کے پاس جائے تو دمینتی اپنی موسی کے پاس گئی ہو۔ اس دن جگدیش آدھ گھنٹے ہی میں بیزار ہو جاتا۔ پنڈت ہند کشور کا گھر کٹّر سناتن دھرمی تھا۔ کھانے پینے میں بھی ان کے یہاں سختی سے پابندی تھی۔ پیاز لہسن نہیں کھاتے۔ چھوت چھات کا بڑا لحاظ۔ پینے کا پانی خود گھر کی عورتیں بھرتیں۔ جگدیش کا آنا جانا اور کھانا پینا بھی پنڈت ہند کشور کے یہاں ہوتا لیکن رنگولی کی کیاریوں میں بٹھا کر کھلایا جاتا۔ دمینتی خود کھانا پروستی اور پانی دیتی۔ پنڈت ہند کشور اور ان کی شریمتی جی کا دھیان تو اس طرف جا ہی نہیں سکتا تھا۔ البتہ نند کشور کچھ کچھ محسوس کرنے لگا تھا۔ نند کشور اور دمینتی میں بہت پیار تھا۔ نند کشور اپنی بہن دمینتی کو ہمیشہ خوش رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ اسی لئے جب کبھی وہ محسوس کرتا کہ دمینتی اداس ہے فوراً جگدیش کو کھینچ لاتا۔ دمینتی گویا ایک خوب صورت کلی تھی جو کھل رہی تھی اور اس کی بھینی بھینی خوشبو سارے گھر میں پھیلی ہوئی تھی۔ جب کبھی یہ اداس ہو تو گویا سارا گھر اداس ہو جاتا۔ دمینتی چلنے میں خوبصورت بولنے میں خوب صورت اٹھنے میں خوبصورت بیٹھنے میں خوب صورت جاگنے میں خوب صورت سونے میں خوب صورت۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خوبصورتی خود اس کے

اطراف گھوم رہی ہے۔ پوری فضا پھیکی پڑجاتی جب ذرا سی اُداسی بھی اس کے چہرے پر آئے۔ اب بات آگے کیسی بڑھے۔ جگدیش کایستھ کا لڑکا اور منیتی ٹھیٹ باچپائی برہمن اور اس پر پورا گھر پُرانا سناتن دھرمی۔

۹

قمر اور رشیدہ پھر چھٹیوں میں حیدرآباد آئے ہوئے تھے۔ کرانتی اور رام نارائن نے طے کیا کہ قمر اور رشیدہ کو ایک پارٹی دیں۔ سنہا جی کے گھر میں پارٹی دینا طے پایا۔ پہلے تو خیال ہوا کہ رات کا کھانا رکھیں لیکن پھر اس خیال سے کہ کھانا ہو تو بیٹھک برابر نہیں جمتی۔ کھانے میں دیر ہو جاتی ہے اور کھانا کھاتے ہی سب گھر جانے کے لئے بے چین ہو جاتے ہیں اس لئے یہ طے ہوا کہ خوب بھرواں ٹی پارٹی ہو۔ کچھ دیسی پکوان ہوں۔ کچھ انگریزی پکوان۔ چنانچہ ، رجون کو پارٹی شام کے (۵) بجے سنہا جی کے مکان پر مقرر ہوئی۔ کرانتی اور رام نارائن سنہا جی کے پاس پہنچے اور پارٹی ان کے یہاں مقرر ہونے کی اطلاع دی۔ سہنیتا نے کہا کہ انتظام تم ہی سب لوگ کر لینا۔ جگدیش نے کرانتی سے پوچھا کہ کس کس کی دعوت ہے۔ کرانتی نے کہا کہ قمر بھیا اور رشیدہ آئیں گی۔ تم ہو اور ریحانہ کو بھی بلایا ہے۔ پتا جی آئیں گے اور ماتا جی بھی۔ سلمہ بھی آ رہی ہیں۔ جگدیش نے کہا کہ پنڈت ہند کشور کے بیٹے نند کشور ہیں نا۔ انھیں بھی بلا لیا جائے تو اچھا ہے اس لئے کہ پنڈت ہند کشور نے تمہارے شادی کی مہورت نکالی تھی۔ اور ان کی بیٹی ونیتی ہے وہ بھی بڑی سوشیل ہے۔

کرانتی۔ ارے بابا۔ وہ تو کٹر سناتن دھرمی ہیں نہ خود کھائیں گے اور نہ دوسرے کو کھانے دیں گے۔ وہ تو پیاز لہسن بھی نہیں کھاتے۔ ہمارا معاملہ تو ایسا ہے کہ ہندو مسلمان چولی دامن۔ وہ جو کھائیں ہم کھائیں اور ہم جو کھائیں وہ کھائیں۔ اپنے پاس تو کباب قیمہ کے کٹلس اور کیک پیسٹری ہی رہیں گے۔

جگدیش۔ نہیں جی۔ جی نند کشور گھر میں تو بہت پرہیز سے رہتے ہیں۔ ماں باپ کا ڈر ہے۔ لیکن باہر چھپے چھپے ہم لوگوں کے ساتھ کچھ کھا لیتے ہیں۔

کرانتی۔ پھر دمینتی کی اپنی پارٹی میں کیسے بنے گی۔

جگدیش۔ دمینتی پرہیز تو کرتی ہے لیکن اتنی کٹر نہیں ہے۔ انڈا گوشت تو وہ بھی نہیں کھاتی لیکن ایک ہی ٹیبل پر اگر پاک کی چیزیں ہوں تو زیادہ تکلف نہیں کرے گی۔

کرانتی۔ میں نے دمینتی کو کالج میں دیکھا ہے۔ ایک دو مرتبہ ملی بھی ہوں۔ اچھی سوشیل لڑکی ہے۔ لیکن بابا یہ ٹھیٹ باچپائی برہمن ٹھیرے۔

جگدیش۔ نہیں جی۔ جی وہ بہت اچھی اور ملنسار لڑکی ہے۔ اور بڑا صاف دماغ پایا ہے۔ اس میں کٹرپن نہیں ہے۔ کرانتی نے رام نارائن کی طرف دیکھ کر کہا ٹھیک ہے۔ پنڈت نند کشور اور دمینتی کو بھی بلا لیا جائے۔ پھر جگدیش سے کہا کہ دیکھو کوئی کرکری نہ ہونے پائے۔ سب لوگ اکٹھا ہونے پر اگر یہ لوگ کہیں کہ ہم یہاں نہیں بیٹھتے وہاں نہیں بیٹھتے۔ یہاں نہیں کھاتے وہاں نہیں کھاتے تو پوری پارٹی کا مزا بگڑ جائے گا۔ دیکھو یہ تمہاری ذمہ داری ہے۔

پارٹی کے دن صبح سے ہی کرانتی سہنا جی کے گھر آگئی۔ اور اپنے دو

سہیلیوں ونیتا اور انیتا کو بھی ساتھ لا لیا۔ ونیتا کوئی بائیس سال کی تھی۔ اور انیتا اُنیس سال کی یہ دونوں مدن موہن سریواستو کی بیٹیاں تھیں۔ ونیتا نے ابھی ابھی پی ایچ ڈی کے لئے اپنا تھیسس سب مٹ کیا تھا۔ انیتا ڈومسٹک سائنس میں گراجویٹ تھی۔ کھانا پکانا اچھا جانتی تھی۔ نئی نئی قسم کے ڈشس تیار کرتی تھی۔ مدن موہن سریواستو گھر کے اچھے تھے۔ انیتا کو کھانا پکانا سکھلانے میں کافی روپیہ خرچ کیا تھا۔ گھروں کی آرائش میں بھی بڑی ماہر تھی۔ ہر آٹھ دن کو گھر کی سجاوٹ بالکل بدل دیتی۔ ایسا معلوم ہو کہ کوئی نیا گھر ہے۔ پھر کم خرچ میں۔ مدن موہن اور سہنا جی کے گھر میں آنا جانا نہیں تھا۔ ویسے باہر باہر صاحب سلامت ہو جاتی۔ تھے تو دونوں کالستھ لیکن ایسے رہتے جیسے کوئی اجنبی۔ کالستھوں کا اکڑپن مشہور ہے۔ غیر فرقے اور غیر ذات سے ایسے گھل مل جائیں گے۔ جیسے قریب ترین عزیز ہیں۔ لیکن اپنے ہی فرقہ اور برادری میں ایک دوسرے سے اجنبی۔ چونکہ کرانتی ونیتا اور انیتا ایک ہی کالج میں پڑھی ہوئی تھیں اور کرانتی بڑی سوشیل تھی وہ خود ہی آگے بڑھ کر سب سے ملتی اس لئے اُس نے ونیتا اور انیتا کو کھینچ بلایا۔ سنہہ لتا کرانتی کی خاطر ان نوجوان لڑکیوں سے بڑے پیار سے ملیں نام پتہ پوچھا۔ اپنے نزدیک بٹھایا۔ پھر لڑکیاں کام کاج میں لگ گئیں۔ لیکن سنہہ لتا کی نظر بار بار انیتا کی طرف جاتی تھی۔

ٹھیک پانچ بجے لتسمرا اور رشیدہ پہنچے۔ ریحانہ بھی آگئی۔ نند کشور اور دمینتی پانچ بجکر دس منٹ پر آئے۔ سلمہ کا انتظار تھا۔

تھوڑی دیر بعد ایک رکشا آئی۔ اطراف پردے لگے ہوئے تھے۔ رکشا کا پردہ جو کھولا گیا تو سلمہ اور اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی چھوکری تھی۔ کرانتی

دیکھ کر آگے بڑھی اور سلمہ کو نیچے اترنے میں مدد دی۔

کرانتی۔ اجی سلمہ بی بی یہاں کوئی گوشہ کے لوگ نہیں ہے۔ آپ کو ایسی محفل میں بلایا گیا ہے۔ جہاں آپ کو گوشہ کی زحمت نہ ہو۔ تم ذرا جھجک سکتی ہو تو قمر سے لیکن وہ تو میرے بھائی ہیں۔ جیسے جگدیش ویسے قمر بھیا۔ سلمہ دراصل پردہ کی قائل نہ تھی۔ وہ تو ماں باپ کے ڈر سے اور ان کو تکلیف نہ ہو اس کی خاطر گھر سے باہر بند رکشا میں نکلتی تھی۔ پھر بھی وہ کھلے بندوں نہیں پھرتی تھی۔ بڑی حیادار تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی خوش اخلاق۔ چند خاص گھرانوں کی حد تک ہی اس کا جانا آنا تھا۔ ان میں سے ایک سنہا جی کا گھر۔ چونکہ ٹی پارٹی سنہا جی کے گھر میں تھی۔ سلمہ کے والد نے اس کو جانے کی اجازت دے دی تھی۔ رام نارائن کے گھر اگر پارٹی ہوتی تو شاید بہاؤالدین شطاری سلمہ کو جانے کی اجازت دینے میں تامل کرتے۔

ساڑھے پانچ بجے تک پوری پارٹی جم گئی۔ ایک ہی ٹیبل پر پاک پکوان اکٹھے کر دیا گیا تھا۔ اور باقی پکوان دوسری طرف۔ یہ احتیاط دینیتی کی خاطر کی گئی تھی۔ جگدیش نے ٹیبل پر پکوان جمانے میں خود حصہ لیا۔ آلو کے شکم پور بھی تھے اور گوشت کے بھی۔ دونوں بالکل ایک جیسے رنگ صورت اور مزا بالکل ایک جیسا بغیر کہے اگر کوئی شخص آلو کا ایک شکم پورا اور گوشت کا ایک شکم پور کھائے تو تمیز نہیں کر سکتا تھا کہ گوشت کا کونسا ہے اور آلو کا کونسا۔ لیکن احتیاط کی خاطر کرانتی کی سہیلی انیتا نے ایک ایک کالی مرچ آلو کے شکم پور کے بیچ میں لگا دی تھی تاکہ کسی کو دھوکا نہ ہو۔

ٹیبل پر دل کھول کر مذاق ہوتا رہا۔ سنہا جی کا گھر تھا سب کو بے تکلفی کا

حق حاصل تھا۔ رشیدہ نے کرانتی سے کہا۔

رشیدہ۔ کرانتی دیکھو تم نے ہماری شادی کرائی اپنی شادی کر لی۔ اب جگدیش کو کب تک کنوارا چھوڑو گی۔ پتا جی اور ماتا جی پر کب تک گھر کا بار رہے گا۔ مانا کہ ان کی صحت اچھی ہے اور اب بھی وہ ہم نوجوانوں سے اچھے ہیں۔ پھر بھی ان کو گھر سے اطمینان چاہیئے۔ گھر میں کوئی بہو ضرور آنا چاہیئے۔ خدا کے فضل سے گھر میں کھانے پینے کی کچھ کمی نہیں ہے۔ جگدیش شادی کر کے بھی اپنی پڑھائی جاری رکھ سکتا ہے۔

جگدیش۔ کیا بھابی۔ کرانتی جی جی نے شادیاں کرانے کا کوئی ٹھیکا لے رکھا ہے۔ ان کو تو بس شادیاں کرانے میں مزا آتا ہے۔ نہیں۔ میں تو کرانتی جی جی کے پسند کی کوئی لڑکی نہیں کروں گا۔ یہ فضول شادیاں مجھ کو پسند نہیں۔ نہ جانے نہ بوجھے بس ایک لڑکا لایا۔ ایک لڑکی بتائی اور کہا کہ شادی کر لو۔ ہم جانور تو نہیں ہیں کسی کے گلے باندھ دو۔ بغیر لو (LOVE) کے شادی بیکار ہے۔

قمر۔ جی جناب تو آپ (LOVE) کی چکر میں ہیں۔ ہماری بھی تو شادی ہوئی وہ بھی ابھی ابھی۔ کرانتی نے دیکھا پسند کیا۔ چچا اور چچی نے دیکھا۔ ماں باپ نے ہاں کہا۔ اور ہم نے شادی کر لی۔ دیکھو ہماری شادی کس قدر کامیاب ہے۔ پیار رمحبت جو شادی سے پہلے کی ہوتی ہے۔ وہ شادی کے بعد اکثر ختم ہو جاتی ہے اور جو پیار رمحبت شادی کے بعد سے شروع ہوتی ہے وہ مرتے دم تک باقی رہتی ہے۔ جس کو تم پیار رمحبت یا LOVE کہتے ہو اور جس کی بنا پر تم شادی

کرنا چاہتے ہو در اصل وہ ایک دھوکا ہے۔ غور کرو پیار در اصل کیا چیز ہے۔ اصل یہ ہے کہ کچھ چیزیں یا کچھ کیفیات تم کو بھا جاتی ہیں۔ اپنی ذات سے پیار تو مرتے دم تک رہتا ہے اس لئے اگر کسی شخص کو اپنے سے پیار نہ ہو تو ایک دم مر جائے اور اپنے سے باہر کی چیزوں سے جو پیار ہوتا ہے وہ اسوقت تک قائم رہتا ہے جب تک کہ بھانے والی کیفیات اُن چیزوں میں باقی رہتی ہیں۔ یا یوں کہو کہ ان ان کیفیات سے استفادہ کی تم میں صلاحیت رہتی ہے۔ تم نے اکثر دیکھا ہوگا کہ بچپن کے اسکول کے گہرے دوست کالج میں آنے کے بعد دور دور ہو جاتے ہیں پھر کالج سے نکلنے کے بعد زندگی میں داخل ہوتے ہیں۔ تو اسکول اور کالج کے دوست چھوٹ جاتے ہیں اور زندگی کے نئے دوست پیدا ہو جاتے ہیں۔ پھر زندگی میں تم جیسا بڑھتے یا گھٹتے جاؤ تو تمہارے دوست بھی حالات کے بدلتے رہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جیسے جیسے تمہاری بھاونائیں بدلتی رہتی ہیں ویسے ویسے تم نئے دوست تلاش کرنے لگتے ہو یا تمہاری بدلتی ہوئی بھاونائیں کے مطابق تم کو دوست ملتے جاتے ہیں۔ ایسی صورتوں میں لوگ خیال کرنے لگتے ہیں کہ بڑا ہو کر غریب کی دوستی چھوڑ دی لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے تم بہ حیثیت ایک جوان مرد کے ایک جوان لڑکی کی طرف کھنچے جاتے ہو۔ کیوں۔ وہ ممکن ہے کہ تمہاری بہن اس لڑکی سے بہت زیادہ خوب صورت، بہت زیادہ گنوان ہو پھر بھی تم اس لڑکی کی طرف کھنچے جاتے ہو۔ تم اس کو پیار سمجھتے ہو۔ یہ پیار نہیں بلکہ جذبہ جنسی ہے۔ اور یہ بالکل قدرتی ہے۔ جانوروں میں بھی یہ جذبہ ہے جانور بھی اسی طرح کھنچے جاتے ہیں۔ جس طرح تم کھنچے جا رہے ہو۔ لیکن

تم میں اور جانور میں فرق ہے جانور میں جبلیات INSTINCTS ہوتے ہیں۔ تم میں نہیں۔ لیکن قدرت نے تمہیں اس کے بدلے ایک اور چیز دی ہے جس کو عقل کہتے ہیں۔ اس کی وجہ سے تم اپنی تمام جذباتی طاقتوں پر قابو رکھ سکتے ہو۔ جب تم اپنے کسی جذبہ سے کام لینا چاہتے ہو تو تم سوچتے ہو کہ اس جذبہ سے کس حد تک کام لیا جائے اور اس طرح کام لینے کا کیا نتیجہ ہوگا۔ بعض وقت تمہارا جذبہ تمہاری عقل پر غالب آجاتا ہے۔ ایسی صورت میں تم سے جو کوئی فعل سرزد ہوگا اس کی عقل ذمہ دار نہ ہوگی۔ تم انسانیت کے درجہ سے گر جاؤ گے۔ اسی طرح جب کوئی جوان مرد جوان عورت کی طرف کھنچے جانے کا جذبہ محسوس کرے تو اس کو چاہیئے کہ فوراً اپنی عقل سے مشورہ کرے کہ عواقب و نتائج کیا ہوں گے۔ بعض وقت ایسا ممکن ہے اور اکثر اوقات ایسا ممکن نہیں۔ میں یہ مانتا ہوں۔ اس لئے ہندوؤں میں بچپن کی شادی کا رواج ایک معنی کر کے بہت اچھا تھا۔ اس لئے کہ جنسی جذبات ابھرنے سے قبل ہی ایک لڑکے اور ایک لڑکی کو اس طرح باندھ دیا جاتا تھا کہ جذبات ابھرنے پر وہ بھٹکتے نہ پھریں۔ بظاہر تو ایسی ہی شادیاں زیادہ کامیاب معلوم ہوتی ہیں۔ بہ نسبت آج کل کی شادیوں کے کہ آج شادی اور کل طلاق۔ چنانچہ خود اپنی شادی کے متعلق کہتا ہوں کہ مجھ کو ایسا موقع ہی نہیں ملا۔ کرانتی جی۔ جی مجھ سے میرے گھر کے حالات سے بالکل واقف ہیں۔ میں نے بالکلیہ اُن پر رکھ دیا تھا کہ وہ ایسا بندوبست کریں گی کہ ہمارا گھر بگڑنے نہ پائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

کرانتی نے ہنستے ہوئے کہا۔ آپ جو کبھی کبھی رشیدہ کو کالج میں دیکھتے تھے نا؟

قمر۔ نہیں جی۔ جی معاف فرمانا۔ ویسے جو عام لڑکیوں پر نظر پڑجاتی ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

جگدیش۔ اچھا تو قمر بھیا۔ رشیدہ بھابی کو پہلے سے آپ دیکھ چکے تھے۔ بس تو میرا پائنٹ POINT صحیح ثابت ہوا۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ انسان پیار پیار پکارتا پھرے۔ پیار در اصل پکارنے کی چیز ہی نہیں ہے۔ ایک نامعلوم کشش ہے۔ جو بیان نہیں کی جاسکتی۔

قمر۔ نہیں جناب ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔ جنسی جذبہ ہے اور کچھ نہیں۔ اور جب واقعی جنسی جذبہ ہے تو پھر انکار کیوں کریں۔ جنسی جذبہ ہے تو ہے۔ یہ حیوانی جذبہ ہے اور بہ حیثیت حیوان ہم نے بھی یہ جذبہ پایا ہے۔ لیکن ہم میں اور حیوان میں فرق یہ ہے کہ انسان نے اس جذبہ کو منضبط کیا ہے۔ اس کو کنٹرول میں کیا ہے۔ اور اس کے ساتھ سوسائٹی کی دوسری چیزیں وابستہ کردی ہیں۔ اور اس انضباط کے طریقہ کا نام شادی رکھا ہے۔ جنسی جذبہ کے تعلق سے اس منضبط راستہ پر چلنے کے بغیر اگر ہم اس جنسی جذبہ میں بہہ جائیں تو سوسائٹی بگڑ جاتی ہے۔ خود فرد بگڑ جاتا ہے۔ سوسائٹی کی بندش ڈھیلی پڑجاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سوسائٹی کی بندش بھی کوئی قائم بالذات چیز نہیں ہے۔ زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ وہ بھی بدلتی رہتی ہے۔ لیکن بہرحال ہر زمانہ کی سوسائٹی ہر ملک کی سوسائٹی اپنی ایک خاص بندش رکھتی ہے۔ یہاں تک کہ کمیونزم میں بھی اس تعلق سے سوسائٹی کی ایک خاص بندش ہے۔ اور اس بندش کی ہر انسان کو پابندی کرنی پڑتی ہے۔

دمینتی قمر اور جگدیش کی اس بحث کو بڑے غور سے سن رہی تھی۔ آنو کا

شکمپور اس کے ہاتھ کا ہاتھ ہی میں تھا اور ہمہ تن گوش بنی ہوئی تھی۔ جگدیش کی بحث کے وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دمینتی کے چہرے پر خون کھیل رہا ہے۔ ایسا لگتا تھا گویا جگدیش کا ہر جملہ اس کے منہ سے نکل رہا ہے۔ لیکن جب قمر کی بحث شروع ہوتی تو ایک سنجیدگی سی دمینتی کے چہرے پر آجاتی۔ سفید پڑجاتی۔ گویا کہ اس کے جسم میں خون نہیں ہے۔

قمر اور جگدیش کی بحث اس طرح کچھ دیر جاری رہی۔ اس کے بعد رشیدہ نے کہا بس بابا بس۔ اور ایک شعر پڑھا۔

شناورے ست کہ بستند سنگ بر پایش
مجردے کہ گرفتار کتخدائی شد

اس شعر پر سب لوگ ہنس پڑے۔ سلمہ ایسے موقع پر چوکنے والی نہ تھی۔ آہستہ سے کہا۔

مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید
بر کلۂ خود باید زد

رات کے آٹھ بجے تک خوش گپیاں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد محفل برخاست ہوئی۔

(۱۰)

دوسرے دن صبح دس بجے سنہا جی چوکے میں بیٹھے تھے۔ سنہہ لتا پھلکے سینک کر دیتی جا رہی تھیں۔ سنہہ لتا نے بات چھیڑی۔

سنہہ لتا۔ کل دنیتا اور انیتا اپنے پاس آئی تھیں۔ آپ نے دیکھا دنیتا تو خیر بڑی ہے۔ لیکن انیتا۔ جگدیش کے لئے آپ کا کیا خیال ہے۔ گھر کے کام کاج میں بڑی چست دکھائی پڑتی ہے۔ طبیعت کی بھی بھولی ہے۔ ایسا گھل مل جاتی ہے جانو اپنی ہی بچی ہے۔ پر مدن موہن سریواستو تو بڑے آدمی ٹھیرے۔ ہم غریبوں پر ان کی نظر کیوں پڑے گی۔ دیکھو ایک ذات ایک برادری۔ ہماری بچی سے ان کی بچیوں کا میل جول پر نہ کبھی انھوں نے ادھر پھٹکا اور نہ ہمارے بارے میں پوچھا۔

سنہا جی۔ ہم نے بھی تو کبھی ان سے میل ملاپ بڑھانے کی کوشش نہیں کی وہ اپنی جگہ خوش ہم اپنی جگہ خوش۔ ایسی باتیں تو عورتوں کی طرف سے ہوتی ہیں۔ تم اپنی جگہ اکڑی بیٹھی رہو تو کون تمہارے گھر آئے گا۔

سنہہ لتا۔ آپ بھی تو کہیں برادری میں جاتے نہ آتے۔ مردوں سے میل ملاپ بڑھے تو عورتوں میں بھی میل ملاپ بڑھتا ہے۔ ان کے گھر کی عورتوں سے کہیں دعوت

مدارات میں مٹ بھیڑ ہوئی بھی تو دور دور رہتی ہیں۔ کون جا کر ان کے گلے پڑے۔ اور زبردستی کی دوستی جتائے۔

سنہا جی۔ یہ تو کایستھوں کی گھٹی میں ہے۔ دنیا تمام سے متر تا جتائیں گے اور بیر رکھیں گے تو اپنی جاتی سے۔ بہر حال شادی بیاہ تو اپنی برادری اور جاتی ہی میں کرتے ہیں۔ ابھی اتنی ہمت نہیں کہ آگے بڑھیں۔ میں تو اب اس بات کا قائل نہیں ہوں۔ کیوں اپنی جاتی اپنی جاتی کہہ کر اپنی برادری کے پیچھے مرتے رہیں۔ اور اب یہ برادری تو اپنے دن گن رہی ہے۔ جس برادری میں خود غرضی اور خود پرستی شروع ہو جائے وہ زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکتی۔ دنیا اتنی ترقی کر گئی ہے۔ اب ہم کو اس ذات پات کے ڈھکوسلوں میں پھنسے نہیں رہنا چاہیئے۔

سنہہ لتا۔ بولنا آسان ہے لیکن کرنا مشکل۔ لڑکی ہو یا لڑکا گھر میں جمنا پڑتا ہے۔ ایک دوسرے کا ماحول ملنا پڑتا ہے۔ ابھی تو سکسینہ برادری کی لڑکی سریواستو میں گئی تو نہیں جمتی۔ ماتھر کی استھانہ میں گئی تو نہیں جمتی۔ پھر کیسے آپ میں باہر نکلنے کی ہمت ہو سکتی ہے۔

سنہا جی۔ نہیں بھئی میں تو جگدیش کے لئے غیر برادری کی لڑکی لاؤں گا۔ یہ اپنی برادری کے لوگوں کی خوشامد کرنے سے تو باہر برادری جانا اچھا ہے اور پھر میرے گھر میں تو ذات پات کی پابندی نہیں ہو سکتی۔

سنہہ لتا۔ جب اپنی برادری میں نہ ملے تو باہر جاؤ نا۔ اپنی برادری میں اچھی خاصی لڑکی ہوتے ہوئے اس کو چھوڑ کر باہر کیوں جائیں۔ میری رائے میں تو انیتا اپنے گھر کی اچھی بہو ہوگی۔

سنہاجی۔ اچھا تو آپ نے اپنی بہو چن لی ہے۔

سنہہ لتا۔ کیوں نہیں۔ کیا مجھکو حق نہیں ہے۔

سنہاجی۔ کیوں نہیں۔ سب کچھ تم ہی کو حق ہے لیکن بے چارے جگدیش سے تو پوچھ لو۔ کیا جو تمہارے پسند آئے اس کے سر باندھ دو گی۔

۱۱

دمینتی بھرپور جوانی میں تھی۔ اس کے روئیں روئیں سے سورج کی کرنیں جیسی کرنیں نکل رہی تھیں۔ کرانتی کی پارٹی کے بعد سے تو جگدیش اس کو دیوتا سروپ نظر آرہا تھا۔ دمینتی کے پتا پنڈت ہند کشور اور ماتا کچھ کچھ بھانپنے لگے۔ لیکن کوئی ایسی بات نہیں تھی جس پر وہ بھڑکتے۔ دونوں طرف طوفان اٹھ رہا تھا لیکن طوفان اپنی حد کے اندر تھا۔ دمینتی جیسی پاکیزہ لڑکی اور جگدیش جیسا شریف اصولی لڑکا۔ دمینتی کے ماں باپ کی ہمت نہیں ہوسکتی تھی کہ کوئی خیال کریں۔ لیکن ایسا خیال آئے بھی تو ان کو ایسے خیال پر شرم آتی۔ دمینتی کے لئے پیام کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہری نارائن شکل کا لڑکا جگدیش نارائن شکل بنارس یونیورسٹی سے سنسکرت میں ایم اے کئے ہوئے تھا۔ اور وہیں لکچرار بھی ہوگیا تھا۔ کنج بہاری مصرا کا لڑکا گوکل بہاری مصرا ابھی جرمنی سے ایکسرے کی تعلیم حاصل کرکے آیا تھا اور کلکتہ کے ہسپتال میں ملازمت بھی مل گئی۔ اور بھی دوسرے پیامات تھے۔ کہیں تو معاملہ لین دین کی وجہ سے اٹک گیا تو کہیں گوپت وان کے مسائل تھے۔

پنڈت ہند کشور کہتے تھے کہ ان کے پاس دس ہزار سے زیادہ کی گنجائش نہیں ہے سب کچھ اسی میں ہوجانا چاہیئے۔ لیکن شادی کے اخراجات میں کم از کم

سات آٹھ ہزار نکل جائیں گے۔ ٹیکے میں کم از کم دو ہزار تو دینے ہوں گے۔ ان باتوں کی بھنبھنی بھنبھنی آواز دمینتی کے کان پر پڑ جاتی تھی۔ اب وہ سُست رہنے لگی۔ جس دن جگدیش ان کے گھر آئے تو اُس دن وہ ہشاش بشاش رہتی ورنہ عام طور پر اپنے کمرے میں بند رہنے لگی۔

کچھ دن سے اس کو روزانہ بخار آنے لگا تھا۔ ہر چند علاج معالجہ ہوا لیکن بخار نارمل نہیں ہوا۔ بازو کے ڈاکٹر پلاریڈی ایم۔ بی۔ بی۔ ایس علاج کر رہے تھے۔ ایک دن بخار یکایک ۱۰۴ ڈگری ہوگیا۔ نندکشور دوڑا ہوا جگدیش کے پاس گیا اور اس کو خبر دی۔ جگدیش کے ایک دوست ڈاکٹر سریندر ناتھ کرجی۔ ایم آر۔ سی۔ پی تھے۔ سنہا جی سے ان کی گہری ملاقات تھی۔ اس تعلق سے وہ جگدیش سے بھی اپنے بچے کی طرح ملتے تھے۔ جگدیش فوراً ڈاکٹر سریندر ناتھ کو لئے پنڈت ہندکشور کے مکان پر پہنچا۔ رات کے آٹھ بجے تھے۔ دمینتی بخار میں بڑبڑا رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے تھرمامیٹر رکھا تو بخار ۱۰۵ ڈگری کو ٹچ کر رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے سر پر برف کی تھیلی رکھنے کہا۔ کچھ مکسچر دیا اور کہا کہ صبح میں فوراً خون کا امتحان ہونا چاہیئے۔ باہر آکر ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ خون کی کمی کا شبہ ہو رہا ہے۔ فوراً خون کا امتحان ہونا چاہیئے۔ اور یہ امتحان صرف سرکاری دواخانہ میں ہو سکتا ہے۔

چنانچہ دوسرے دن صبح ۹ بجے ٹیکسی لائی گئی۔ لیکن رائے یہ ہوئی کہ دمینتی دواخانہ جانے کے قابل نہیں ہے۔ خون کے امتحان کے ڈاکٹر کو گھر پر لایا جائے۔ جگدیش صبح سات بجے سے پنڈت ہندکشور کے مکان پر پہنچ گیا تھا۔ فوراً ہی وہ خون کے امتحان کے ڈاکٹر کے مکان پر پہنچا اور ان کو گھر لایا۔ ڈاکٹر نے دمینتی کا خون لیا۔

اس وقت دمینتی اُٹھ بیٹھی تھی اور ہنس رہی تھی۔ بخار ۱۰۰ تک اتر آیا تھا۔ جگدیش کو دیکھ کر وہ اس طرح باتیں کر رہی تھی۔ جیسے وہ بیمار ہی نہیں ہے۔ لیکن لوگوں نے اس کو زیادہ باتیں کرنے سے منع کیا۔ جگدیش ڈاکٹر کے ساتھ دواخانہ گیا۔ چار گھنٹہ میں رپورٹ آئی جس سے ظاہر ہوا کہ خون میں ریڈ بلڈ کارپسل کم ہو گئے ہیں۔ لیوکیمیا کا شبہ کیا جانے لگا۔ ڈاکٹر سریندر ناتھ کرجی کے پاس رپورٹ پیش ہوئی۔ انھوں نے کچھ دیر سوچا پھر کچھ انجکشن لکھے۔ دو دن کے علاج کے بعد دمینتی کے چہرے پر کچھ سرخی نظر آنے لگی۔ اب وہ اپنے بستر پر بیٹھ کر کچھ غذا کھانے لگی اور ہنسنا بولنا بھی شروع کیا۔ لیکن اس ہنسی کے پیچھے زردی اور پھیکے پن کے آثار تھے۔ عزیز و اقارب کی رائے ہوئی کہ دمینتی کی جلد شادی کر دینی چاہیئے۔ اتنی عمر تک لڑکی کو بٹھا رکھنے سے یہ حال ہوتا ہے۔ اور یہ باتیں دمینتی تک جاتی تھیں۔ ایک دن جب کہ نندکشور تنہا دمینتی کے پاس بیٹھا تھا۔ دمینتی نے کہا۔

دمینتی۔ بھیّا سب اب میری شادی کی سوچ رہے ہیں۔ اور یہ سب میری بھلائی کے لئے کر رہے ہیں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اپنے پاس ابھی ذات برادری سے باہر شادی نہیں کر سکتے۔ اگر ایسا ہو تو میرے ماں باپ کو سخت دکھ ہوگا۔ اور میں نہیں چاہتی کہ میرے ماں باپ کو دکھ ہو۔ مجھے ایک سپنا پڑا ہے۔ جس میں میں نے دیکھا کہ جگدیش نے میرے مانگ میں سیندور بھرا۔ پھول کا ہار میرے گلے میں ڈالا اور جب میں اس کے چرن چھونے نیچے جھکی تو ایسا معلوم ہوا کہ ان چرنوں میں بالکل غائب ہو گئی۔ پھر مجھے میرا شریر دکھائی نہیں دیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرا پورا شریر جگدیش کے شریر میں گھل مل گیا۔ میرا کوئی علٰحدہ شریر ہے ہی نہیں۔

اس طرح سے میری شادی جگدیش سے ہو چکی ہے۔ لیکن یہ شادی جگدیش کے استھول شریر کی میری استھول شریر سے نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ جگدیش کا سوکشم شریر بہ حیثیت پرش اور میرا سوکشم شریر بہ حیثیت استری ایک دوسرے میں گم ہو گئے ہیں۔ جگدیش کا استھول شریر ایک دن گل سڑ جائے گا۔ اور اسی طرح میرا استھول شریر بھی اب گل سڑ جا رہا ہے اور دو چار دن ہی میں چھوٹ جائے گا۔ میرے اس شریر سے جگدیش کے استھول شریر کو کوئی سنبندھ نہیں ہے۔ میری آتما استری روپ میں اور جگدیش کی آتما پرش روپ میں ان گلنے سڑنے والے شریروں سے الگ ہو کر مل چکی ہیں۔ پس اب میری دنیاوی شادی کا خیال چھوڑ دو۔ میرا یہ استھول شریر صرف دو چار دن کا مہمان ہے۔ اس کی فکر نہ کرو۔ جگدیش کو ہر روز میں اپنے ہردے میں دیکھ رہی ہوں۔ بلکہ جب جگدیش یہاں نہیں آتے۔ تو میں زیادہ تر ان کا درشن میں اپنے ہردے میں کرتی ہوں۔ ویسے جگدیش کی مرضی ہے وہ آئیں یا نہ آئیں۔ وہ بس میرے بھگوان ہیں۔ اتنی باتیں کرنے سے دمینتی پر غشی طاری ہو گئی اس کے بعد وہ بے ہوش ہو گئی۔ جگدیش کو اطلاع ہوئی وہ ڈاکٹر سریندر ناتھ بنرجی کو لیکر آیا۔ ڈاکٹر صاحب نے دیکھ کر کہا کہ COMA ہو گیا ہے۔ اب چند گھنٹوں کی مہمان ہے۔ رات کے آٹھ بجے دمینتی ہمیشہ کی نیند سو گئی۔

۱۲

دمینتی کو مرکر دو سال ہو گئے۔ دمینتی کی موت جگدیش کے لئے زندگی میں پہلا شاک اور زبردست شاک تھا۔ لیکن اسی شاک نے جگدیش کی اندرونی اندریوں کو جگانے میں مہمیز کا کام کیا۔ اب جگدیش ایک بہت بڑا مقرر ہو چکا تھا۔ اس کی دھواں دھار تقریریں مجمعوں پر مسمریزم کی کیفیت پیدا کر دیتی تھیں۔ جدھر چاہتا مجمع کو بہالے جاتا۔ اس کی آمد پر ہی زوردار تالیوں کی گونج ہوتی۔ اتنی تالیاں بجتیں کہ پوری تقریر سنائی نہیں دیتی۔ جگدیش نے اب سوٹ پہننا چھوڑ دیا تھا۔ صرف سفید سوتی کرتے اور پاجامہ میں رہتا۔ لیڈر قسم کا آدمی ہو گیا تھا۔ ہر طرف اس کی واہ واہ ہوتی تھی لیکن اس کے چہرے سے ایسا معلوم ہوتا کہ اب بھی بہت ہی پیچھے اندر ہی اندر زندگی کے پھیکے پن کی جھلک ہے۔ ویسے سب سے ہنستا بولتا مذاق کرتا جیسے کہ اس کی عادت تھی لیکن اندرونی پژمردگی اپنی جھلک دکھاتی تھی۔ جگدیش کچھ دبلا ہو گیا تھا۔ لیکن دُبلے پن سے اور خوب صورت دکھائی دینے لگا۔ نستمر تو اکثر کلکتے میں رہتے۔ رام نارائن بہنوئی تھے۔ ان سے دوستی بہت تھی لیکن بے تکلفی نہیں۔ نند کشور اب جگدیش کے لئے سب کچھ تھا۔ گویا نند کشور کے روپ میں وہ دمینتی کو دیکھتا۔ نند کشور بھی جگدیش کا ہاتھ

سایہ کی طرح رہنے لگا۔ سنہا جی اور سنہا تا جگدیش کی یہ حالت دیکھ کر متفکر رہنے لگے۔ دوستوں نے مشورہ دیا کہ جگدیش کی شادی اب ہونا ہی چاہیئے۔ لیکن جب شادی کا ذکر جگدیش کے سامنے کیا جاتا تو کہتا کہ میری شادی ہو چکی۔ زندگی میں صرف ایک شادی ہوتی ہے۔ بار بار شادی نہیں ہوتی۔

ایک دن صبح آٹھ بجے جگدیش اپنے دیوان خانہ میں بیٹھا تھا۔ نظام کالج سے اسٹوڈنٹس کی ایک جماعت جگدیش کے پاس آئی۔ اور کہا کہ EMOTIONAL INTEGRATION پر ایک ٹاک دیں۔ آج کل کا یہ BURNING TOPIC ہے۔ موجودہ اور آنے والی نسل کے لئے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ جگدیش راضی ہو گیا۔ آنے والے اتوار کو (۵) بجے شام سالار جنگ ہال میں محفل مقرر ہوئی۔ اسٹوڈنٹس نے ہوشیاری یہ کی کہ نہ تو اخباروں میں نیوز آئیٹم دیا اور نہ کوئی پوسٹر لگایا۔ سالار جنگ ہال ایک چھوٹا سا ہال۔ اگر اس ٹاک کی پبلسٹی کی جاتی تو ہال کافی نہیں ہوتا۔ اور ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ بڑے مجمع کو کنٹرول کرنا بہت مشکل تھا۔ بہر حال اس ٹاک کی اطلاع صرف نظام کالج کے طلبا برادری تک محدود رہی۔ عثمانیہ یونیورسٹی کالج کے کچھ طلبا کو علم ہو گیا تھا وہ بھی پہنچ گئے۔ طلبا نے بڑے سلیقہ سے سیٹوں کا ارینجمنٹ کیا تھا۔ سامنے کی سیٹیں پروفیسر اور گرل اسٹوڈنٹس کے لئے ریزرو کر دی گئیں۔ نہایت متانت اور سنجیدگی سے گرل اسٹوڈنٹس کو بٹھایا گیا۔ کوئی بدتمیزی یا ہڑبونگ نہ ہونے پائی۔ سمجھدار اور متین لڑکوں کو گرل اسٹوڈنٹس کی نشست کے انتظام کے لئے رکھا گیا تھا۔ کچھ لڑکیاں بھی اس انتظام میں شریک تھیں۔ ٹھیک پانچ بجے جگدیش نندکشور کے ساتھ آئے۔ طلبا نے ان کا خیر مقدم کیا اور اسٹیج پر بٹھایا۔ جگدیش نے پہلے

ہی کہہ دیا تھا کہ گل پوشی وغیرہ نہیں ہونی چاہیئے۔ چنانچہ جگدیش اسٹیج پر آتے ہی ایک اسٹوڈنٹ نے کھڑے ہو کر درخواست کی کہ مسٹر جگدیش ایموشنل انٹگریشن پر ٹاک دیں۔

جگدیش۔ مجھے ایسے موضوع پر عرض کرنے کہا گیا ہے جسکے متعلق آج کل کمیٹیاں ہو رہی ہیں۔ کانفرنسیں ہو رہی ہیں سمینار مقرر کئے جا رہے ہیں۔ گورنمنٹ کے بڑے بڑے عہدہ دار ممبران پارلیمنٹ و اسمبلی و منسٹراں۔ سب اس موضوع پر اظہار رائے فرما رہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کہوں۔ لیکن میں ایک موٹی سی بات عرض کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ پہلے مرض کیا ہے اس کی تشخیص ہونی چاہیئے۔ مرض کی تشخیص ہونے کے بعد اس پر غور ہونا چاہیئے کہ وہ مرض قابل علاج ہے بھی یا نہیں۔ مرض کے اسباب کیا ہیں اگر قابل علاج ہے تو کونسا علاج مجرب ہے۔ پھر علاج کس طرح سے ہو۔ کس ڈاکٹر کے ذریعہ علاج کیا جائے۔

اب آپ کہتے ہیں کہ ہندوستان کی ساری آبادی میں ایموشنل انٹگریشن EMOTIONAL INTEGRATION ہونا چاہیئے۔ بالفاظ دیگر آپ تسلیم کرتے ہیں کہ ڈیس انٹگریشن DISINTOERGRATION ہے اس کی جگہ INTEGRATION ہونا چاہیئے۔ اس DISINTGERGRATION سے آپ کی کیا مراد ہے۔ جس کو آپ INTEGRATION سمجھ رہے ہیں کیا اس سے پہلے DISINTGERGRATION تھا۔ یہ DISINTGERGRATION کب سے ہے۔ دور نہ جائیے۔ صرف آندھرا پردیش کو ہی لے لیجئے۔ یہاں پر کما ہیں ویلما ہیں۔ ریڈی ہیں۔ رکشتری ہیں۔ برہمن ہیں۔ پھر دوسرے فرقوں میں تم جس کو BACKWARDDESS کہتے ہو ہیں۔ تم نے جن کو SCHE بنا دیا ہے وہ ہیں۔ یہ فرقے اور جاتیاں برٹش گورنمنٹ کے DULEDCASTS

زمانہ میں تھیں۔ اس سے پہلے بھی صدہا سال سے تھیں۔ مغلیہ دورِ حکومت میں یہ تھے اور اس سے پہلے بھی یہ فرقے اور جاتیاں تھیں اور اب بھی ہیں۔ کیا ہم کما کو دلیا بنا سکتے ہیں۔ کیا دلیا کو ریڈی بنا سکتے ہیں۔ کیا ریڈی کو برہمن بنا سکتے ہیں اور برہمن کو ریڈی۔ نہیں ہرگز نہیں۔ اگر تم یہ دعویٰ کروگے تو یہ جھوٹا دعویٰ ہے۔ یہ سمجھ لو کہ تم لوہے کی دیوار پر اپنا سر مار رہے ہو۔ ہندوستان میں کچھ مسلمان بنے اور کچھ عیسائیت میں شامل ہوئے۔ اسلام اور عیسائیت قبول کرنے کے بعد یہ ہوا کہ سابقہ جاتی بھید ایک حد تک ٹوٹ گیا لیکن وہ دوسری صورتیں اختیار کرتا گیا۔ ایک نئی قسم کا جاتی بھید شروع ہوا۔ برہمن جو عیسائی ہوتا ہے یا مسلمان اور مانگ جو عیسائی ہوتا ہے یا مسلمان آپس میں درجہ کا فرق محسوس کرتے ہیں۔ زبان سے گو وہ نہ بولیں۔ یا اکنامک پوزیشن اونچی ہو جانے کی وجہ یہ فرق زیادہ دکھائی نہ پڑے لیکن فرق ضرور رہتا ہے۔ زبان سے تو مساوات کہی جاتی ہیں۔ لیکن عمل میں فرق باقی رہتا ہے۔ عربستان جہاں پر اسلام اٹھا اور جہاں سب مسلمان ہیں۔ خود وہاں جاتی بھید ہے۔ وہاں نہ صرف انسان کا بلکہ گھوڑوں کا حسب نسب بطور شجرہ خاندان رکھا جاتا تھا۔ عربستان میں جو عربی نہیں ہیں وہ عجمی ہیں۔ اس موقع پر آپ کو ایک دلچسپ قصہ نہیں بلکہ پرانا واقعہ سناتا ہوں۔ ایک ایرانی جو عربی زبان میں کامل دسترگاہ رکھتا تھا۔ عربی اس طرح بولتا اور لکھتا کہ ٹھیٹ عرب معلوم ہو۔ برسوں اس نے عربستان میں گزارے۔ اور اپنے کو عرب باور کرا کے ایک عربی عورت سے شادی کی۔ شادی ہوکر دو چار برس ہوگئے۔ وہ عربی عورت اس شخص کو عرب ہی سمجھتی رہی۔ میاں بیوی ہنسی خوشی زندگی گزار رہے تھے۔ ایک دن رات کے وقت گھر میں چراغ جل رہا تھا۔ سونے کا وقت ہوا۔ اس شخص نے اپنی بیوی سے

کہا کہ چراغ بجھا دے۔ "اُقتُل السراج"۔ بس کیا تھا۔ عورت پریشان ہوگئی۔ فوراً اٹھ بیٹھی اور مرد کو ڈانٹنے لگی کہ بتا تو اصل میں کون ہے۔ چراغ بجھانے کو عربی میں کوئی دوسرا ہی محاورہ ہے۔ "اقتل السراج" جو مرد نے استعمال کیا وہ اصل میں فارسی محاورہ کا ترجمہ تھا۔ تحقیق شروع ہوئی بالآخر معلوم ہوا کہ مرد ایرانی نسل سے ہے عورت نے فوراً طلاق لے لی۔ اسی طرح عیسائیوں میں بھی انڈین کرسچین ہیں۔ اینگلو انڈین ہیں۔ یوروپین ہیں۔ پھر انگلستان میں جاؤ تو مزدور کلاس الگ۔ کاروباری کلاس الگ پروفیسر کلاس الگ۔ شاہی خاندان الگ۔ امرا الگ۔ دنیا میں یہ جاتی بھید ہے۔ اور رہے گا۔ یہ ہمارے رہنما جو ہندوستان کے پیچھے پڑے ہیں کہ جاتی بھید مٹاؤ غلط ہے بلکہ تم اس جاتی بھید کو مٹانے کے جو طریقے اختیار کرتے ہو اتنا ہی وہ بڑھتا جا رہا ہے۔ کما سے دلیا۔ دلیا سے ریڈی اور ریڈی سے برہمن کیوں بنانا چاہتے ہیں۔ کما۔ دلیا۔ ریڈی اور برہمن کے فرق کو کیوں آپ مٹانا چاہتے ہیں۔ نہ تو آپ مٹا سکتے ہیں اور نہ یہ مٹ سکتے ہیں۔ رہا دوسری جاتیاں جن کو تم نے نیچی جات کہا ہے۔ یہ بھی اپنی جاتی میں رہتی ہیں اور چھوڑنا نہیں چاہتیں۔ ان میں نہ کوئی برہمن بننا چاہتا ہے نہ اکشتری نہ ریڈی نہ دلیا بلکہ اب تو برہمن اکشتری اور ویش۔ وھیڑا اور چار ہونے کا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں۔ کچھ انٹرکاسٹ اور انٹر کمیونٹی شادیوں کا ڈھونگ رچا کر ہم کو خوش نہیں ہونا چاہیئے کہ ایموشنل انٹگریشن ہو رہا ہے اس میں دو آدمیوں کی شادی ہو جاتی ہے۔ لیکن دس خاندانوں میں منافرت پیدا ہوتی ہے۔ میری رائے میں جاتیوں کا فرق DISINTEGR-ATION کی وجہ نہیں ہے۔ DISNTEGRATION کا سبب ہے

بڑی وجہ معاشی حالات کا فرق ہے۔ آپ امریکہ جائیں جرمنی جائیں کمائیں کھائیں اور پڑھیں۔ EARN WHILE YOU LEARN کوئی نہیں پوچھتا۔ آپ کو اگر ہندوستان میں کہیں نوکری دیجائے کوئی کام دیا جائے تو بس اعتراضات کی بھرمار شروع ہوئی۔ دیکھو برہمن کے لڑکے کو نوکری دی۔ پس ماندہ طبقے یا ہریجن کا حق غصب کیا یا دیکھو آندھرا والے کو عمداً جگہ دیدی اور تلنگانہ والے کا حق غصب کیا۔ جاتی اور پرانت بھید کا سہارا محض اپنی حجت کو قوی کرنے کیا جاتا ہے اور رہنمایانِ قوم اپنی لیڈری کی خاطر موقع کے لحاظ سے اس جماعت کی یا اس جماعت کی پکار کی تائید کرتے ہیں۔ اور آپ جانتے ہیں کہ اس پکار کے پیچھے کیا جیسز اندرونی طور پر کارفرما رہتی ہے۔ جماعت کو جماعت سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ جماعت خود آلۂ کار ہوتی ہے۔ کسی فرد کے اغراض و مقاصد کی تکمیل کی۔ کسی لیڈر کو اپنے بیٹے کو نوکری دلانی ہے یا کسی دوسرے لیڈر کے بیٹے کو نوکری دلانی ہے تاکہ دوسرا لیڈر اپنے بیٹے کی دوسری جگہ تائید کرے۔ اور اس کے لئے جاتیوں اور جماعتوں میں ٹکر کرا دی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کسی اہم پل بنانے کے لئے جہاں کسی تجربہ کار اور موزوں ترین انجینیر کی ضرورت تھی وہاں ایک نکما انجینیر آجاتا ہے۔ ایسے نکمّے انجینیر سے ملک کا جو اہم پل بنے گا۔ اس کی کیا حالت ہوگی آپ اندازہ کرلیں۔

پہلے تو ایک پرانت میں EMOTIONAL INTEGRATION ہونا چاہیئے۔ خود پرانت میں آپس میں جو تناؤ چل رہا ہے تو ایک پرانت کی دوسرے پرانت سے انٹگریشن کی بات بے معنی اب ایک پرانت میں انٹگریشن کیسے ہو۔ خود آندھرا پردیش کو لے لو۔ پولیٹیشن جو سب جگہ انٹگریشن کرانا چاہتے ہیں۔ خود انگریمنٹ نہیں تو کیسے انٹگریشن کرائیں گے۔

آندھرا پردیش بننے سے پہلے جو حیدرآباد تھا اس کا ہم اب مرثیہ پڑھتے رہتے ہیں کہ کیا خوبصورت کیا انٹگریٹیڈ حیدرآباد تھا۔ حیدرآباد تین پرانت کے ٹکڑوں کا ایک ملک بنا ہوا تھا۔ جس کی حکومت پر ایک اور پرانت کا عنصر چھایا ہوا تھا۔ اس طرح تین پرانت کے تین ٹکڑے ایک بنے رہے۔ سرکاری زبان اردو رہی۔ ظاہر ہے کہ یہ مصنوعی بندش تھی۔ لیکن یہ بندش دو سو برس تک قائم رکھی گئی۔ اس دو سو برس کی بندش بھی اپنے اثرات باقی نہ رکھ سکی۔ موقع ملتے ہی تینوں ٹکڑے الگ ہو گئے۔ لیکن الگ ہو کر جائیں کہاں۔ حسب قاعدہ کہا۔ ہر ٹکڑا اپنے اپنے پرانت کو چلا جائے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ ایک طوطے کو اگر آپ عرصہ تک پنجرے میں بند رکھ کر اس کو پھر دوسرے طوطوں میں چھوڑ دیں تو سب طوطے اس کو چونچیں مارنے لگ جاتے ہیں۔ یہی حال ہر ٹکڑے کا ہوا اور ہو رہا ہے۔ اب یہ سوال وقت کا ہے کہ اس طوطے کو پھر کب نئے پر پھوٹیں کب وہ پھر سے ان کے برابر کا ہو اور ان سے ٹکر لینے کے قابل ہو جائے تاکہ اپنے ٹوٹے ہوئے پرانت سے جڑ جائے۔ چھ برس تو گزر چکے۔ ابھی تو چیں پڑتی ہی ہیں۔ پرانے پر گرے نہیں۔ نئے پر آئے نہیں۔ دوسری طرف ایک مسئلہ ان کا ہے جن کے ہاتھ میں حکومت تھی۔ یا اس زمانہ کی فضا کے لحاظ سے اپنا اپنا پرانت چھوڑ کر اس ترکئے میں گھس گئے تھے۔ اور اس کو ہی اپنا پرانت بنا لیا تھا۔ ہندوستان بھارت ورش ایک ملک ایک دیش رہا۔ ایک دستور والا۔ پرانت پرانت کی بات تو راج نیتی کی خاطر ہے۔ ویسے سب بھارت ورش ایک ہے۔ اس لئے ان بھیاؤں سے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اپنے اپنے پرانت سدھارو۔ ادھر

بھیا جی جو دو سو برس سے یہاں رہ گئے بس گئے۔ کچھ اپنے زمانہ کی حکومت کے جراثیم بھی
دماغ میں ایسا سوچ میں ہیں کیا کریں۔ اپنے پرانت کا رُخ کریں تو اُدھر NO VACANCY
الٹے پاؤں واپس ہو جانے کا ڈر۔ اِدھر ابھی بھی نہیں۔ آندھرا پردیش۔ بھارت درش
کے بیچوں بیچ۔ سرحدی یا پنجابی نہیں کہ ڈنڈا بجا دیں۔ کہا کہ اچھا بابا تمہاری اردو ہم مانتے
ہیں لیکن آندھرا بھاشا سیکھو۔ محنت کرنا شروع کرو نوابی ٹھاٹ چھوڑو سادہ زندگی
رکھو۔ ہم جیسا رہتے سہتے ہیں تم بھی ویسا رہو۔ لیکن یہ بھی بھلا کوئی سننے کی بات ہے ہم نے وہ وہ
بریانی کھائی مرغ انڈے کھائے۔ وہ وہ ٹھاٹ کے کپڑے پہنے وہ چائے اور سگریٹ
پئے۔ سال کے تین سو پینسٹھ دن میں دو سو دن کی چھٹی۔ پھر رخصتِ اتفاقی۔ رخصت استحقاقی
رخصت بیماری۔ رخصت تعلیمی۔ رخصت اتحادی الگ۔ پھر دن تمام میں تین گھنٹے کام کیا
تو پورا دفتر صاف کر دیا۔ اب کہتے ہیں کہ دفتر میں آٹھ گھنٹے بیٹھو۔ چھٹیوں میں کام کرو۔
پھر دفتر کہاں حسین ساگر تالاب کے پاس۔ پہلے گھر کے پیچھے دفتر تھا۔ اس پر فیملی پلاننگ
کا یہ حال کہ ایک ایک گھر میں دس دس بچے۔ میں نے اپنے بعض آندھرا احباب سے
کہا کہ بھئی ہم خود ہو کر تمہارے پاس نہیں آئے تم خود ہی ہمارے گھر میں آئے۔ اور ہم سے
سمجھنے کیا نہیں آپ کو سب کچھ سہنا پڑیگا۔ میں نے یہ شرط بھی لگائی کہ پانچ برس میں تم سب
ہمارے جیسے نواب اور راجہ ہو جاؤ گے۔ یہ یہاں کی آب و ہوا کی تاثیر ہے۔ یہ بھی کہا کہ
اس وقت آندھرا پردیش میں پنجابی، ایرانی کرناٹکی خوب جمے ہیں۔ خوب دھندا کر رہے
ہیں اور کما رہے ہیں۔ تم آندھراؤں کو ان سے شکایت نہیں ان کو تو گلے لگاتے ہو۔
ہم نے کیا قصور کیا جو پشت ہا پشت سے یہاں رہ گئے۔ اور تمہارے ہی ہو گئے۔ اس نے
جواب دیا کہ پنجابی، ایرانی سندھی اور کرناٹکی اپنی محنت سے اپنی روٹی کماتے ہیں۔

دن رات خون پسینہ ایک کرتے ہیں۔ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔ اور تم ہو کہ
سوائے نوکری کے کچھ نہیں اور اس کے لئے سب کو سلام کرتے رہتے ہو۔ تلگو پرانت
میں اتنے برس رہے پھر بھی تلگو نہیں آئی۔ تلگو سیکھنا اور اچھی طرح سیکھنا بالکل اٹل
بات ہے۔ آندھرا دوست کی بات کا میں بالکل قائل ہو گیا۔ جہاں تک کہ ہم لوگوں کے
انٹگریشن کا تعلق ہے ہم کو ہماری آل اولاد کو چاہیئے کہ تلگو میں بالکل ماسٹر ہو جائیں
فارسی سیکھی اردو سیکھی۔ انگریزی سیکھی تلگو کیوں نہیں سیکھ سکتے۔ نہیں تو سیدھا اپنے پرانت
کی راہ لو۔ اور حکومت سے درخواست کرو کہ تم کو تمہارے متعلقہ پرانت میں جذب کرادے۔

جہاں تک حیدرآباد کے تلگو بولنے والوں کا تعلق ہے۔ ان بیچاروں کو
حکومت میں زیادہ دخل نہیں رہا تھا۔ اپنے زراعتی کاروبار میں مصروف رہے۔
نوابی دور حکومت میں کچھ نوابوں کی باتیں سیکھ لی۔ دوسری طرف آندھرا والے
برٹش حکومت کے تحت خوب رینڈے گئے۔ اوپر سے تامل والوں کا ان پر غلبہ۔
حکومت چلانے کا ان کو بھی خاص تجربہ نہیں۔ برٹش حکومت نے جس طرح ہندوستانیوں
کو دبا رکھا تھا خصوصاً مدراس میں اس کی پیداوار۔ اِدھر حیدرآباد میں ناز و نعمت
میں پلے۔ غلامی کیا چیز نہیں معلوم۔ برٹش گورنمنٹ کی کیا نوکری ہوتی ہے نہیں معلوم
گو حکومت میں زیادہ دخل نہیں تھا۔ اور مسلمان راجہ تھا۔ پھر بھی اکثر ایسی تھی جیسے
ہم خود مختار رہیں۔ فرسٹ کلاس برٹش اڈمنسٹریٹر حیدرآباد میں کلیدی عہدوں پر
رہے۔ حیدرآباد کی رعایا سے انھوں نے اس طرح سلوک نہیں کیا جس طرح وہ برٹش انڈیا
میں کرتے تھے۔ آندھرا والے کو ٹاٹن ہام سسٹم ان کا دیا اور قرآن اور تلنگانہ والے
سیدھے کام کے قائل۔ تیسری چیز یہ کہ پولیس ایکشن سے پہلے کے دور میں حیدرآبادی

دیلما کو ریڈی نہیں بنا سکتے۔ ریڈی کو برہمن نہیں بنا سکتے۔ نہ پنجابی کو مدراسی بنا سکتے ہیں اور نہ مدراسی کو پنجابی۔ نہ گجراتی کو بنگالی بنا سکتے ہیں۔ نہ بنگالی کو گجراتی۔ اور نہ ان تمام تفرقوں کو مٹا سکتے ہیں۔ یہ سب تفریق معاشی فرق کی وجہ سے بھیانک صورت اختیار کرتی ہے ورنہ کچھ نہیں۔ ایک مانگ گستہ دار کے پاس دس لاکھ روپے آجائیں تو ملڑو سے وہ بی۔ٹی ملیشم ہو جاتا ہے۔ پنڈت شرما کے مکان میں چار پر بلایا جاتا ہے۔ ادھر پنڈت معرا کے پاس پیسہ نہ ہو اور پوجا پاٹ پر گزر بسر ہو تو ان کو زنانی گھر میں پوجا کے کمرہ کا رستہ بتایا جاتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ پرانت پرانت کے انٹگریشن کے لئے ایک پرانت سے دوسرے پرانت میں اسمبلی کونسل جوڈیشری اور دیگر اونچی ملازمتوں میں کافی تعداد بذریعہ نامزدگی لی جانا چاہیئے۔ ہر پرانت میں سنٹرل گورنمنٹ کی طرف سے ایک اعلیٰ افسر رہنا چاہیئے جو اس امر کی نگرانی کرتا رہے کہ برابر عمل ہو رہا ہے یا نہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر ایک پرانت کے کچھ لوگ دوسرے پرانت میں ہوں اور وہ وہاں سے اپنے پرانت کو منتقل ہو جانا چاہیں تو اس افسر کا فرض ہوگا کہ ایسے منتقل ہونیوالوں کو پوری سہولتیں پہنچائے اور پوری طرح ان کو متعلقہ پرانت میں جما دے۔

تیسرے میناری اور مجاری کے الفاظ بالکل مٹا دیئے جانے چاہیئے۔ جبکہ ہمارے دستور میں سب برابر ہیں تو مجاری اور میناری کے الفاظ بے معنی ہیں۔ یہ الفاظ بڑے بڑے جھگڑوں کا پیش خیمہ ہوتے ہیں۔ پچھڑے پس ماندہ طبقات اور درج فہرست اشخاص کے طبقات کی اصطلاحوں کو فوراً ختم کر دینا چاہیئے۔

اب قانون کی نظر میں نہ کوئی چھوٹا ہے اور نہ بڑا۔ اگر کوئی طاقتور کسی کمزور پر غلبہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو ملک کا معمولی قانون اس کی حفاظت کرے گا۔ اس تفریق نے ملک

حکومت میں بہت کچھ کچرا ابھر دیا گیا تھا۔ اس سے سابقہ الگ۔ آندھرا والے اپنی ذہنیت چھوڑنے تیار نہیں اور تلنگانہ والے "پدرم سلطان بود" پر اڑے ہوئے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ ہر فریق اپنی اپنی بات بالکل بھول جائے۔ اور نئے سرے سے نیا نظام حکومت بنائے جو ملک کے موجودہ حالات کے مطابق ہو اور جس میں پورے ملک کی بہتری ہو۔ یہ خیال کہ ہم مجارٹی میں ہیں۔ میناریٹی کو کھا جائیں گے چلنے والی بات نہیں۔ دوسرے ہمسایہ پرانت کے کتنے لوگ اس پرانت میں رہ گئے اور بس گئے ہیں۔ ان کو اسمبلی یا کونسل میں کوئی جگہ نہیں تو پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک پرانت کا دوسرے پرانت سے میل جول ہو۔ دوسرے پرانت والا اس پرانت میں غیر ہی رہا۔ اس طرح اس کا وجود اجنبی کا وجود ہو گیا۔

میری رائے میں اس کا حل یہ ہے کہ ہر پرانت کی اسمبلی کونسل، عدلیہ اور دیگر اعلیٰ ملازمتوں نیز یونیورسٹی و کالج میں دوسرے پرانت کی کافی تعداد رہنا چاہیئے۔ اور اس کو متعلقہ پرانت کی طرف سے نامزدگی کے ذریعہ لانا چاہیئے۔ ہر پرانت میں ایسا عمل ہونا چاہیئے۔ بلکہ ایسے آنے والوں کو کچھ اسپیشل الونس بھی دیا جانا چاہیئے۔ حیدرآباد کے حالات کی وجہ سے یہاں پرانت بھاشائیں بالکل دب گئی تھیں۔ امید ہے کہ پرانت بھاشا اب ابھر آئیں گی۔ پرانے حیدرآباد کے نواب شاہی دور کے لوگ اگر ان کو زندہ رہنا ہے تو بہت جلد پرانت کی بھاشا میں دسترس حاصل کرنا ہوگا۔

آج کل بہت زور اس پر دیا جا رہا ہے کہ تعلیمی نصاب ایسا بنانا چاہیئے کہ اس کی وجہ سے انٹگریشن پیدا ہو۔ بچپن ہی سے دماغوں کی اس طرح تربیت ہونی چاہیئے۔ یہ برین واش BRAIN WASH چلتا نہیں۔ آپ کما کو ویلما نہیں بنا سکتے۔

پورے نظام کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ اور لیڈر اپنی سلامتی کے لئے اس تفریق کا سہارا لیتا ہے۔ یہ نہیں دیکھتا کہ اس کی وجہ سے ملک میں کیا تباہی آ رہی ہے۔ پانچویں انٹگریشن کو دستور میں سنٹرل لسٹ میں آنا چاہیئے اور اس کے تحفظ کی ذمہ داری بالکلیہ سنٹر پر ہونی چاہیئے۔ ایک لڑکا اٹھ کر پوچھ بیٹھا

لڑکا۔ مسٹر جگدیش۔ ہم امتحان میں ساٹھ فیصد نمبر پاتے ہیں لیکن ہم کو میڈیسن اور انجینیرنگ میں داخلہ نہیں ملتا۔ دوسرا لڑکا جو چالیس فیصد نمبر حاصل کیا ہے۔ محض اس وجہ سے کہ عادل آباد کا ہے یا محبوب نگر کا ہے اس کو داخلہ مل جاتا ہے۔ یہ کونسا انٹگریشن ہے اور اس کا کیا حل ہے۔

دوسرا لڑکا۔ اجی جناب اگر آپ کی جیب میں چھ ہزار روپے ہوں تو چاہے آپ پینتیس فیصد نمبر حاصل کریں آپ کو میڈیسن میں داخلہ مل جائے گا۔

تیسرا لڑکا۔ بس یہی نہیں جناب۔ مقابلہ کا امتحان ہوتا ہے۔ انٹرویو ہوتا ہے۔ اگر چار مسلمان لڑکے پہلے نمبر پر آ جائیں تو چونکہ مسلمان کے لئے سیٹ ایک یا دو مقرر ہیں اس لئے ایک یا دو کو داخلہ ملے گا۔ اور باقی دو RIGHTABOUT TURN

جگدیش۔ ہاں میرے عزیز دوستو آپ صحیح فرماتے ہیں۔ اس لئے تو میں یہ کہتا ہوں مجارٹی مینارٹی کی اصطلاحیں ختم کر دینی چاہیئے۔ انٹگریشن سنٹرل سبجکٹ ہونا چاہیئے۔ اور سنٹرل گورنمنٹ کی طرف سے ایک نگرانکار افسران امور کی نگرانی کے لئے مقرر ہونا چاہیئے۔ جب پورا ملک ایک ہے تو پھر پرانت کی اصطلاحوں میں سوچنا غلط ہے۔ پرانت تو انتظامی امور کی سہولت کے لئے بنائے گئے ہیں۔ پرانت بنانے کا مقصد بھارت ورش کی مختلف فرقوں یا قوموں میں تقسیم نہیں ہے۔ اور نہ اس کی بنا پر

کوئی فرقہ یا جاتی اپنے الگ حقوق کا مطالبہ کر سکتی ہے۔ آپ حضرات نے امتحانات اور تعلیم وغیرہ کا ذکر چھیڑ دیا ہے اس سلسلے میں میرے خیالات بھی سن لیجئے انگریزی کی تعلیم کی وجہ سے انگریزوں کے زمانہ میں جو ایک قسم کی ایکتائی نظر آتی تھی وہ دراصل ایکتائی نہ تھی وہ تو ایک دکھاوا تھا۔ انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کو میں تو قلعی کے برتن سمجھتا ہوں۔ دیکھنے کو اوپر سے سب سفید لیکن اندر کوئی لوہا ہے تو کوئی پیتل۔ کوئی تانبا ہے تو کوئی کانسا۔ قلعی آخر قلعی ہے۔ چند دنوں تک رہے گی۔ اصل یکسانیت جو ہم میں تھی اس کا تو انگریزوں نے قلع قمع کر دیا تھا۔ ہندو مسلمان کا جھگڑا کھڑا کیا۔ اردو، ہندی کا بکھیڑا ہوا۔ برہمن غیر برہمن کا شگوفہ نکلا۔ بہرحال حکومت اسی طرح کی جا سکتی تھی۔ اور کی گئی۔ دیکھو بھائی تعلیم کا جو اصل مقصد ہے اس کو سمجھ لینا چاہیئے۔ یہ انگریزوں والا تعلیمی مقصد چلنے کی بات نہیں۔ تعلیم کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان میں جو جوہر چھپے ہیں ان کو ابھارا جائے۔ ان کو چمکایا جائے ان کو جلا دی جائے۔ بیوپار دھندا ہنر الگ باتیں ہیں۔ پہلے تو انسان کو انسان بناؤ اور ساتھ ساتھ اس کو ملک میں دولت بڑھانے میں حصہ لینے دو۔ اتنے فیصدی نمبر لئے تو تعلیم میں آؤ۔ اتنے فیصدی نمبر لئے تو ہنر میں جاؤ۔ یہ دھاندلی نہیں چلے گی۔ جو انسان جس ہنر کے قابل ہے اس ہنر میں جانا ہی چاہیئے۔ جو انسان جس تعلیم کے قابل ہے اس تعلیم میں جانا ہی چاہیئے۔ تم ایک طرف بڑی تنخواہ کا لالچ دیتے ہو اور دوسری طرف آمد کا دروازہ بند کر دیتے ہو۔ جانتے ہو اس کا حشر کیا ہوگا۔ جدھر بڑی تنخواہ دیکھ پڑی ادھر ہی لوگ دوڑ پڑتے ہیں خواہ ان میں صلاحیت ہو یا نہ ہو۔ اس ہڑبونگ میں اصل صلاحیت والے پیچھے

رہ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر میڈیسن کو لو۔ جس کو دیکھو میڈیسن کی طرف بھاگ رہا ہے۔ لڑکیاں سب اُدھر بھاگ رہی ہیں۔ میں نے کئی لڑکیوں سے پوچھا کہ بابا تم ادھر جا رہی ہو اگر تم کو پاس ہونے کے بعد کسی تعلقہ یا گاؤں یا ضلع میں بھیج دیا جائے تو تم کیا کرو گی۔ کہتی ہیں کہ ہم کوشش کر کے شہر میں رہ جائیں گے۔ یا تو اپنا دواخانہ کھولیں گے۔ کتنے شہر میں رہیں گے اور ایسے کتنے دواخانے کھولیں گے پھر دواخانہ کھولنے کو روپیہ کہاں سے آئے گا۔ ماں باپ تو پچیس برس ڈاکٹری پڑھا کر پورے گڑھے میں اتر گئے اوپر سے صاحبزادی کو ایک دواخانہ بھی لگا دینا ہے۔ پھر دواخانہ چلے کیسا جب تک کہ گلوکوس کے انجکشن والا معاملہ شروع نہ ہو۔ اس پر صاحبزادی کی کمپونڈری کون کرے۔

اور ایک چیز کی طرف میں ملک کی توجہ منعطف کرانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جس طرح گھوڑ دوڑ ہوتی ہے جس طرح ہتھیاروں کی دوڑ ہو رہی ہے اسی طرح تعلیم میں بھی دوڑ مچی ہوئی ہے۔ فرقہ جاتیاں سب اس دوڑ میں لگی ہوئی ہیں۔ ہر فرقہ اور جاتی دوسرے فرقے اور جاتی پر سبقت لے جانا چاہتا ہے۔ یم اے یم ایس ہوئے تو کافی نہیں فرسٹ کلاس ہوں۔ فرسٹ کلاس ہوں تو پھر ٹاپ کریں۔ اچھے بُرے دونوں ذرائع سے نہ صلاحیت کا لحاظ ہے نہ رجحان کی فکر۔ نہ صحت کی پروا ہے نہ اخراجات پر غور۔ پھر تعلیم ختم ہونے کے بعد جدھر دیکھو ہائے ہائے۔ صحت پوری تباہ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قبر سے مردے اُٹھ کر آئے ہیں۔ جسم میں خون نہیں۔ گال پچکے۔ ڈراؤنی صورت۔ اس پر آنکھوں پر عینک جس طرح کھانا، پینا، سونا، اٹھنا، بیٹھنا زندگی کے نارمل افعال ہیں اسی طرح تعلیم و تربیت

بھی نارمل افعال ہونا چاہیئے۔ طالب علم تعلیم و تربیت اسی سہولت اور اطمینان سے حاصل کرے جس طرح وہ زندگی کے دوسرے افعال انجام دیتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ بس ایک دوڑ ہے RACE۔ ایک شخص دوسرے شخص پر۔ ایک فرقہ دوسرے فرقہ پر ایک جماعت دوسری جماعت پر یہاں تک کہ ایک ملک دوسرے ملک پر سبقت لیجانے کی کوشش میں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص جینا نہیں چاہتا بلکہ ایک دوسرے کو پیچھے کر دینے میں لگا ہوا ہے۔ اور اس کے جینے کا مقصد ہی دوسرے کو پیچھے ڈھکیل دینا ہے۔

موجودہ تعلیم کا مقصد ایک ساتھی کو گرا دینا اور خود آگے بڑھ جانا ہے۔ یہ دوڑ کب تک چلے گی۔ اس کی کوئی حد بھی ہے۔ جب تم اس طرح ایک دوسرے کو کھا جانا چاہتے ہو تو تم حیوان سے بدتر ہو۔ حیوان تو ضرورت کے موافق کھانا چاہتا ہے اور تم ضرورت بے ضرورت سب ہڑپ کرنا چاہتے ہو۔ بس ایک دھن ہے۔ امریکہ آگے بڑھ گیا ہے۔ جرمنی آگے بڑھ گیا ہے۔ روس آگے بڑھ گیا ہے۔ جاپان آگے بڑھ گیا ہے۔ ہم بھی آگے بڑھیں گے اور ان کے برابر ہو جائیں گے آخر یہ قومیں کیا آگے بڑھیں اور کیا تیرا۔ بے شک آسمان پر اُڑ رہے ہیں۔ سمندروں کی تہ میں گھس رہے ہیں۔ پہاڑوں کے سینے چیر رہے ہیں۔ لیکن حالت یہ ہے کہ بارہ گھنٹے کام کرنا۔ نہ رہنے کا ٹھکانا نہ کھانے پینے کی جگہ۔ بیوی ایک طرف میاں دوسری طرف۔ بچہ ایک طرف۔ ماں باپ دوسری طرف۔ دن کے بارہ گھنٹے کام کیا۔ رات کے بارہ گھنٹے فکر میں گزرے۔ بے شک موٹر ہے۔ کرایہ کا فلاٹ ہے۔ کچھ فرنیچر ہے لیکن بیوی کہاں بچے کدھر۔ آخر اتنا سب کچھ کر کے انسان نے اپنے لئے کیا کیا۔ کیا بارہ گھنٹے کام کے بجائے چھ گھنٹے کام کیا۔ وہ کون سے لمحات ہیں۔

جن کے متعلق وہ کہہ سکے کہ یہ اس کے لمحات تھے۔ بہت ہوا غم غلط کرنے سینما دیکھ لیا۔ یا شراب پی لی۔ کیا یہی تعلیم کا مقصد ہے۔ اس تعلیم اور اس ہڑبونگ کی زندگی سے کتنے خلل دماغ کے بیمار ہو رہے ہیں۔ کتنوں کے ہارٹ فیل ہو رہے ہیں۔ کیا اس کا نام زندگی ہے۔ جدھر دیکھو تعلیم کا ذکر۔ اجی کیا تعلیم دے رہے ہو کس کو تعلیم دے رہے ہو کوئی سوچتا ہی نہیں۔ جو پڑھے لکھے تعلیم یافتہ کہلا رہے ہیں وہ کونسا چمتکار دکھا رہے ہیں۔ آج کل کی پڑھائی سے تو پرانے غیر تعلیم یافتہ کے دماغ ٹھیک ہیں۔ عقل سلیم ان میں ہم سے زیادہ ہے۔ بس انگریزی زبان کی دھونس ان پر جما کر ان کو مرعوب کرنا چاہتے ہو۔ جدھر دیکھو انگریزی وہ بے چارے تھوڑا مرعوب ہو جاتے ہیں۔ ہم تعلیم یافتہ دھوپ میں کھڑے رہے تو پگل جاتے ہیں۔ چھاؤں اور سردی میں سکڑ جاتے ہیں۔ چار میل پیدل نہیں چل سکتے۔ عینک بغیر کچھ دیکھتا نہیں۔ انجینیر اور ڈاکٹر بن کر اکڑتے پھرتے ہیں۔ نہ پانی میں اتر سکتے نہ پہاڑ پر چڑھ سکتے۔ نہ وبائی بیماریوں میں گھس سکتے ہیں۔ نہ کوئی صحیح نسخہ لکھ سکتے۔ بس PATENT ادویہ اور ان کے اشتہاروں پر کام چل رہا ہے۔ پھر کماتے کیا ماہانہ تین سو چار سو روپے۔ ادھر ان کو دیکھو جن کو تم غیر تعلیم یافتہ کہتے ہو۔ دن رات مئی، جون، جولائی کی دھوپ میں جنگل جنگل ایسا پھرتے ہیں جیسے چودھویں رات کی چاندنی میں۔ لاکھوں کا حساب انگلیوں پر۔ لاکھوں روپے بے دریغ پانی کی طرح پھیلا دیتے ہیں۔ اس طرح لاکھوں روپے کماتے بھی ہیں اور کھوتے بھی۔ یہاں راتوں جاگ کر آنکھیں پھوڑ کر کمائے تو کیا کمائے تین سو روپے چار سو روپے اور وہ بھی ماں باپ کا پچیس تیس ہزار روپیہ خرچ کر کے انگریزی لباس پہن لیا کچھ انگریزی ٹٹ پٹ کر لی بس صاحب بن گئے۔ باقی سب گنوار۔ آخر یہ بھی کوئی

پڑھائی ہے تعلیم ہے۔ جدھر دیکھو انگریزی کا جنون۔ اس اسکول میں بچے کو بھیجیں گے جہاں ذریعہ تعلیم انگریزی ہو۔ ان اسکولوں میں بھی پہلے یہ کوشش ہوگی کہ سینٹ جارج گرامر اسکول میں داخلہ ملے۔ اس کے لئے وہ خوشامدیں وہ چاپلوسی وہ جبیں فرسائی ہوتی ہے کہ دیکھنے کے قابل۔ اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ دار میٹرن (داخلہ دینے والی) کی نگہ غلط انداز کے متلاشی رہتے ہیں۔ اور وہ انھیں اس طرح جھڑک کر بات کرتی ہے شاید کسی نے اپنے ادنیٰ ملازم سے بھی ایسا سلوک نہ کیا ہوگا۔ سینٹ جارج کے بعد سینٹ میری۔ کینرز کانونٹ کے طواف ہوتے ہیں۔ وہاں سے نیچے اترے تو آل سینٹ، لٹل فلاور وغیرہ۔

ذریعہ تعلیم انگریزی اختیار کرنے سے لڑکے اور لڑکیوں کا یہ ستیاناس ہو رہا ہے کہ انگریزی زبان پر ان کو بہت توجہ دینی پڑتی ہے۔ ایک زبردست بار بچپن سے ہی ان کے دماغوں پر ہو جاتا ہے۔ اینگلو انڈین اور کرسچین تو چونکہ گھر میں بھی ان کی بات چیت اکثر انگریزی میں ہوتی ہے اور راست بچپن سے وہ اس طرح بات چیت کرتے ہیں اور ان کے ماں باپ کے لئے بھی انگریزی زبان اوڑھنا بچھونا ہے۔ ان کو اسکول اور کالج میں انگریزی زبان ذریعہ تعلیم ہونے سے فائدہ ہے۔ لیکن دوسری جاتی یعنی ہندو، مسلمان، سکھ، جن کے گھر کی زبان تلگو، مرہٹی، ہندی، اردو، پنجابی، ہوتی ہے۔ صرف اسکول میں ان کو انگریزی سے سابقہ پڑتا ہے۔ سخت مصیبت میں مبتلا رہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ کچھ الٹرا ماڈرن ماں باپ بچپن سے ہی اپنے بچوں کو ممی ڈاڈی بولنا سکھا دیتے ہیں۔ اور شروع سے ہی اپنا بچہ ڈاگ کیٹ۔ کیاٹ بی اور انگلش پوئیٹری یاد کرنے پر فخر کرتے ہیں ان کو کسی قدر کم تکلیف ہوتی

ہوگی۔ لیکن میں تو اس کو بھی ماننے تیار نہیں ہوں۔ بچہ کا دماغ غیر زبان کی وجہ سے دب جاتا ہے۔ یہ بات انگریزی زبان کے ساتھ ہی نہیں ہے ہر زبان کا یہ حال ہے بچہ بچپن سے جس زبان کے ماحول میں بڑا ہوا ہے۔ اور جس زبان کے ماحول میں رہتا ہے اس سے ہٹ کر اگر تم کسی دوسری زبان میں اسکو تعلیم دینے کی کوشش کروگے تو ضرور اس پر بوجھ ہوگا۔

میں تم کو اپنے والد کا حال کہتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ ہم لوگوں کی زبان اردو ہے۔ اردو کو ذریعۂ تعلیم بنا کر جب عثمانیہ یونیورسٹی کھولی گئی تو اس سے پہلے میرے والد سٹی ہائی اسکول میں پڑھتے تھے جہاں ذریعۂ تعلیم انگریزی تھا۔ اس اسکول میں ان کو انگریزی میں پینتیس چالیس فیصد نمبر آتے تھے۔ انگریزی کی کمزوری کی وجہ سے دیگر مضامین میں بھی کمزوری رہتی تھی۔ عثمانیہ یونیورسٹی کا جب میٹرک قائم ہوا تھا تو میرے والد پانچویں فارم میں تھے۔ فوراً وہ عثمانیہ میٹرک کے امتحان میں بیٹھ گئے۔ اور صرف ایک مہینے کی تیاری میں وہ درجہ دوم میں کامیاب ہوگئے۔ اس کے بعد کالج کی پڑھائی ان کے لئے ایسی تھی جیسے کوئی کھیل یہ اس وجہ سے کہ ذریعۂ تعلیم اردو ہوگیا تھا اور ہر مضمون کو بلا تکلف اردو میں لکھ پڑھ سکتے تھے اور ڈھٹائی کے ساتھ پروفیسر سے سوالات کر سکتے تھے۔ نجانے اس کے جو حیدرآباد کے دوسرے ہندو بھائی تھے یعنی تلگو اور مرہٹی والے ان کو اسی طرح دقت ہوتی تھی جس طرح ہمکو انگریزی میں دقت تھی۔ اس لحاظ سے میری یہ رائے ہے کہ اگر ہر پرانت میں ذریعۂ تعلیم پرانت کی بھاشا ہوجائے تو طالب علم کی آدھی عمر بچ جاتی ہے۔ اس کے دماغ پر بار نہیں ہوتا۔ اور یہ جو تھوڑے لوگ انگریزی پڑھے ہوئے اور سرکاری زبان انگریزی ہونے کی وجہ اپنی اکڑ بتا رہے ہیں۔ سب کا خاتمہ ہوجائے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہوگی کہ عام رعایا جو آپ کے انگریزی لباس سے انگریزی زبان سے

آپ کو جو شریطان سمجھ رہی ہے اس ڈر سے نجات پائے گی اور آپ کا جھوٹا رعب بھی نہیں چلے گا۔ میں کبھی کبھی عدالتوں میں جاکر وکیلوں کی بحث سنا کرتا ہوں مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جسکی انگریزی اچھی اس کا پلّہ بھاری رہتا ہے۔ اگر وہی بحث کسی دیسی بھاشا میں ہو جو وکیل اور جج کی زبان ہے تو ایک معمولی وکیل ایک اچھے انگریزی داں وکیل پر چھا جائے۔ اس کے متعلق تو میرے والد بھی حیدرآباد ہائی کورٹ کی روایات بیان کرتے تھے۔ جہاں اردو ہی میں بحث ہوتی تھی اور فیصلے ہوتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ زمانہ جدید کے علوم و فنون کا ذخیرہ بہت کچھ انگریزی میں ہے۔ امریکہ اور انگلستان کی زبان انگریزی ہے۔ اور ان کے پاس کا علوم و فنون کا ذخیرہ انگریزی زبان میں ہے۔ ہم نے بھی دو سو برس میں انگریزی بہت کچھ سیکھ لی تھی۔ لیکن انگریزی کا علم صرف ایک دو فیصد آبادی تک محدود ہے۔ اس کو پورے ہندوستان پر حاوی نہیں کیا جا سکتا۔ علوم و فنون کا ذخیرہ جرمنی زبان، روسی زبان، فرنچ زبان، جاپانی زبان میں بھی ہے۔ اور ان زبانوں میں بھی بالکل جدید زمانہ کے علوم و فنون ہیں۔ ہمکو یہ ذخیرہ بھی حاصل کرنا ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ پرانت پرانت کی زبان کے ماہر مترجم جمع کئے جائیں جو ہر بدیسی زبان کے علوم و فنون کو پرانت کی زبان میں منتقل کریں۔ اور جلد سے جلد یہ کام ہونا ہے۔

اصطلاحات کو تو بین الاقوامی حیثیت سے جوں کا توں منتقل کرلیا جا سکتا ہے۔ ان اصطلاحات کے ترجموں میں سر پھوڑنا اس وقت ٹھیک نہیں ہے۔ اور ترجمے ہونے تک تعلیم تو پرانتی بھاشا میں دی جا سکتی ہے انگریزی کتابوں کے ساتھ۔ جیسا کہ عثمانیہ یونیورسٹی میں ہوا۔ یعنی کتابیں سب انگریزی میں رہتی تھیں لیکن پڑھائی اور جوابات اردو میں ہوتے تھے۔

اس میں کوئی دقت نہیں تھی۔

ایک مشکل یہ ہے کہ پرانت پرانت میں دوسری پرانت کے کافی لوگ ہیں۔ ان کی تعلیم کا کیا انتظام ہو۔ اور یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگ انگریزی کو ذریعہ تعلیم رکھنے پر اصرار کرتے ہیں۔ ہندی بھاشا کے خلاف بھی اسی وجہ سے آوازیں اٹھتی ہیں۔ اس مشکل کا حل نکالنا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ مشکل حل ہوتی جائے گی کیونکہ جب ایک پرانت میں رہنا ہے تو اس کی بھاشا لازماً سیکھنی ہوگی۔ ایسے بھاشا بھاشی والوں کے لئے عارضی طور پر انتظام کیا جا سکتا ہے۔ پر اسی وجہ سے ملک کی عام ترقی اور تعلیم کو روکا نہیں جا سکتا ہے۔ پرانتی بھاشا میں اونچے سے اونچے درجہ کی تعلیم کا بندوبست فوراً ہونا چاہئے۔ انگریزی کے ذریعہ کام چالو رہنے کی وجہ سے اس پر کافی توجہ نہیں ہو رہی ہے۔ بلکہ تساہل برتا جا رہا ہے۔ یہ درست نہیں ہے۔

ایسے موقع پر کچھ منچلے لڑکے آ ہی جاتے ہیں جو اکثر پچھلی نشست پر رہتے ہیں۔ ایک نے اٹھ کر کہا۔

لڑکا۔ معاف کرنا جگدیش صاحب مداخلت معاف۔ یہ انسانی جوہر چمکنے اور چمکانے کی بات تو ہمارے سمجھ میں نہیں آئی۔ ابھی ہم نے اتنا فلسفہ نہیں پڑھا۔ ہم کو تو اتنا معلوم ہے کہ یہ سب پڑھنا پڑھانا روپیہ کمانے کی خاطر ہے۔ ہمارے ماں باپ اتنا روپیہ ہماری تعلیم پر اسی لئے خرچ کرتے ہیں کہ ہم خوب روپیہ کمائیں۔ اور ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ اچھا خوبصورت بنگلہ ملے۔ ایک موٹر کار آج کل جو اسٹینڈرڈ کی ہے نا۔ کم از کم پانسو روپیہ ماہوار اور ایک عمدہ خوبصورت بیوی ایم۔ ایس۔ سی یا پی۔ ایچ۔ ڈی نہیں (سامنے کی رو کی طرف اشارہ کرکے) بلکہ سترہ اٹھارہ برس کی معمولی پڑھی لکھی۔ ہم میں سے کوئی بیچارہ صرف

LAMBEREDA. پر ہی قناعت کرنا چاہتا ہے کوئی بائیسکل پر ہی قانع ہے۔

بہر حال فکر ہر کس بقدر ہمت اوست" بعض وقت ہم کو بیوی کے ساتھ موٹر کار یا لمبریڈا مل جاتی ہے۔ لیکن اس کے لئے کم از کم ہم کو بی۔ اے یا ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کرنا پڑتا ہے۔

جگدیش۔ اچھا اگر تمہارا مقصد روپیہ کمانا ہے تو اس کی ترکیبیں دوسری ہیں۔ تعلیم و تربیت سے تو تمہارا دماغ اور کمزور ہو جائے گا۔ گڑمبہ کا بزنس لے لو۔ گھر بیٹھے لاکھوں روپے رولو۔ پندرہ بھٹیاں شراب کی چوری سے کھولدیں۔ ایک سو غنڈوں کو نوکر رکھ لیا۔ جو اطراف نگرانی کرتے رہے۔ پولیس آئی۔ ایک دو غنڈوں نے خود اپنے کو گرفتار کرا دیا۔ ان کا جرمانہ بھر دیا۔ قید کی سزا پائی تو اتنے دن ان کے گھر والوں کی پرورش کا انتظام کر دیا۔ کوئی گھر اپنے نام نہیں کوئی کرایہ نامہ اپنے نام نہیں۔ آج پولیس والے بھٹیاں توڑ دیں کل دوسرے بھٹیاں تیار ہو گئیں۔ کاروبار بدستور جاری۔ بمبئی کو شراب جا رہی ہے۔ مدراس کو شراب جا رہی ہے۔ موٹر کے ٹیوب میں۔ سیکل کے ٹیوب میں وغیرہ وغیرہ۔ پھر شراب کی بوتلوں کے لئے جھوٹے لیبل تیار۔ اسکاچ وسکی کا بلیک اینڈ وائیٹ کا۔ بوتلوں کے لیبل بھی بالکل یورپی لیبل جیسے بس سونا ہی سونا۔ پڑھنے کی ضرورت نہ لکھنے کی ضرورت۔ لیکن آپ اس وقت تک اتنا پڑھ لکھ چکے ہیں کہ ایسے کام کی جرأت نہیں کر سکتے۔

دوسرا لڑکا۔ جناب پچھلی سیٹ سے جو ریمارک کیا گیا وہ ہماری ساتھی گرل اسٹوڈنٹ کی انسلٹ ہے۔ ہم ایسا انسلٹ برداشت نہیں کر سکتے۔

اس پر سامنے کی رو ROW سے ایک لڑکی نے اٹھ کر کہا۔

لڑکی۔ نہیں کوئی انسلٹ کی بات نہیں ہے۔ بے شک ہم ایم سی سی اور پی ایچ ڈی

کر رہے ہیں اور ہمارے دوست ابھی بی اے میں چار سال سے ایڑیاں رگڑ رہے ہیں۔ ان کو تو کوئی گنوار چاہیئے۔ کسی گڑمبہ شراب کے بھٹی والے کی بیٹی جو چھوٹا سا بنگلہ ایک اسٹینڈرڈ موٹر کار یا کم از کم لمبریٹا اسکوٹر پر کچھ گڑبڑ شروع ہو رہی تھی کہ جگدیش نے خاموش خاموش۔ کہا اور ساتھ ہی جلسہ برخاست ہو گیا۔

---

(۱۳)

جگدیش دن بدن نحیف۔ لیکن اس کا دماغ تیز ہوتا جا رہا تھا۔ اب اس کے چہرے کے اطراف ایک نورانی ہالا معلوم ہونے لگا۔ نند کشور اب ہمیشہ اس کے ساتھ رہنے لگا۔ نند کشور کے غیاب میں جگدیش بے چین سا ہو جاتا۔ جگدیش کے کمرہ میں صرف ایک تصویر تھی اور وہ تھی وشنو کی۔ باقی کمرہ بالکل خالی۔ الماری کے ایک خانہ میں گیتا، قرآن اور انجیل دھری ہوئی تھیں ان کے ساتھ ہی گرونانک کے گرنتھ صاحب، پارسیوں کی کتاب اوستا جین دھرم کی کتابیں۔ دوسرے خانہ میں مشرقی فلاسفی اور مغربی فلاسفی کے نامور فلاسفروں کی کتابیں تھیں۔ تیسرے خانہ میں شعر و شاعری کی کتابیں۔ تصوف کی کتابیں مثنوی مولانا رومؒ، شمس تبریز، گلستاں، بوستاں، اور اردو کے مخصوص شعراء کے کلام۔ سنہا جی اور سنہا نے بہت کوشش کی کہ جگدیش کی شادی کر دیں اس کو دنیاوی امور میں لگا دیں۔ لیکن اب وہ بہت آگے بڑھ گیا تھا۔ ریحانہ بھی جگدیش کے پاس آنے جانے لگی۔ جگدیش کی باتوں سے ریحانہ کچھ اتنا متاثر ہو گئی تھی کہ اس کو بھی جگدیش کو دیکھے بغیر چین نہیں پڑتا تھا۔ ریحانہ کے والد جگدیش کے رنگ ڈھنگ سے خوب واقف ہو گئے تھے۔ انھوں نے ریحانہ کے جگدیش کے پاس آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں عائد کی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ نند کشور اور ریحانہ گویا جگدیش کے دو شِشّ بن گئے۔ جگدیش کی زندگی اب فقیرانہ طرز اختیار کرنے لگی۔ جگدیش کا عام محفلوں اور جلسوں میں آنا جانا کم ہو گیا۔ زیادہ تر اس کی بیٹھک اس کے اپنے کمرہ میں ہی ہوتی یا کبھی وہ نند کشور کے پاس چلا جاتا۔ خود اس کے کمرہ میں یا نند کشور کے مکان پر مختصر احباب جمع ہو جاتے اور گفتگو کسی نہ کسی موضوع پر ہوتی۔ لیکن گفتگو میں سابقہ گرمی و حرارت کے بجائے گمبھیرتا اور گہرائی ہونے لگی۔ جگدیش کی ان چھوٹی بیٹھکوں میں ڈاکٹر نند کمار پی ایچ ڈی، گنگا سرن ودیا النکار اور پنڈت ہردے ناتھ شاستری بھی آنے لگے۔ نند کشور اور ریحانہ تو جگدیش کے ساتھ سایہ کی طرح رہنے لگے۔ جگدیش ریحانہ کو آپا کہہ کر پکارتا تھا۔ اس طرح سب لوگ جو جگدیش کے پاس آتے ریحانہ کو آپا کہہ کر پکارنے لگے۔ ریحانہ جگ آپا ہو گئی۔ ایک دن جب کہ ڈاکٹر نند کمار، گنگا سرن اور پنڈت ہردے ناتھ شاستری اور دیگر احباب جمع تھے۔ ڈاکٹر نند کمار نے بحث چھیڑی کہ دنیا تمام میں کہیں ہیرو ورشپ نہیں ہے۔ روس نے PERSONALLTY CULT کے خلاف جد و جہد شروع کر دی ہے۔ پر ہمارے ہندوستان میں ہیرو ورشپ کا دور ختم نہیں ہوتا۔ اس پر پنڈت ہردے ناتھ شاستری نے کہا۔

پنڈت ہردے ناتھ شاستری۔ ہمارے دیش میں روحانیت نے جنم لیا ہے۔ ہمارے دیش میں جو منش اونچا ہوتا ہے وہ روحانیت کے بل پر ہی اونچا ہوتا ہے۔ خواہ سیاست ہو یا شاعری۔ اونچا ہونے والا انسان یہاں اسی کا سہارا لیتا ہے۔ اسی لئے بھارت ورش کا انسان اونچا ہونے میں مہاتما یا اوتار بنا دیا جاتا ہے۔ اس کے گن گانا شروع ہو جاتا ہے۔ اس کی پوجا اور استتی ہونے لگتی ہے۔ عام لوگ اس کے درشن کے لئے دیوانہ وار گرنے لگتے ہیں۔ یہ اسی روحانیت کا کرشمہ ہے۔

ڈاکٹر نند کمار۔ روحانیت کسی ایک دیش کی ہی پونجی نہیں ہے۔ اگر روحانیت کا وجود ہے تو وہ ہر دیس میں ہے اور ہر دیس میں رہنی چاہئے۔ روحانیت کوئی الگ چیز نہیں ہے جو آسمان سے کسی خاص دیس میں ٹپکے۔ نہ تو روحانیت کوئی الگ ڈائمنشن ہے جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں۔ مادیت، عقلیت اور روحانیت کا تفرقہ صرف سمجھ کا پھیر ہے۔ یہ باتیں اس زمانہ میں چلتی تھیں۔ جس وقت مادیت کو ایک مردہ چیز عقلیت کو اس سے اونچے درجہ کی چیز اور پھر روحانیت کو اس سے اونچے درجہ کی چیز سمجھا جاتا تھا۔ اس سے جتنے عام انسان ہیں روحانیت سے گر گئے تھے اور صرف چند کو مہاتما اور رشی منیوں کی پدوی دے دی گئی۔ روحانیت کے معنی ہمہ گیری کے ہیں جس میں مادیت، عقلیت اور نفسیات سب داخل ہیں۔ روح کوئی شئے عقل نفسیات اور جسم سے الگ نہیں ہے۔ ایک موٹی مثال بجلی کی لے لو۔ بجلی تم کو روشنی کی صورت میں، گرمی کی صورت میں قوت کی صورت میں دکھائی پڑتی ہے۔ کیا بجلی ان صورتوں سے الگ ہے؟ نہیں۔ اگر وہ ظاہر ہوئی تو تم نے کہا روشنی گرمی اور قوت اور ظاہر نہیں ہوئی تو بجلی کہہ کر خاموش ہو گئے۔ کیا تم اس بجلی کو بیان کر سکتے جو کسی صورت میں تمہارے اندریوں میں سے کسی سے بھی محسوس نہ ہو۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ انٹیوشن گیان دھیان سے انسان میں ایک اور اندری اجاگر ہوتی ہے جس سے روح کا ادراک ہوتا ہے۔ اور بڑے بڑے مہاتما رشی منیوں کو اس طرح ادراک ہوتا ہے۔ اگر اس طرح واقعی ادراک ہوا تو سمجھ لو کہ پھر بھی کسی ظہور کا ہی ادراک ہوا۔ اصل روح کا ادراک نہیں ہوا۔ بجلی کے تار کو تم نے ہاتھ لگایا۔ تم کو شاک پہنچا۔ زبردست شاک پہنچا۔ تم بے ہوش ہو گئے۔ کوہ طور والی بات۔ پھر بھی کیا تم کو بجلی کا ادراک ہوا۔ نہیں۔ تم کو صرف بجلی کی ایک اور

صورت کا ادراک ہوا اور بس۔ اسی طرح روح کی بابت سمجھ لو۔ روح اور روحانیت جس کو تم نے ایک الگ چیز بنا رکھا ہے۔ وہ الگ ہے ہی نہیں۔ سب کچھ وہی ہے جو تم کو تمہارے "تم" کی وجہ سے مختلف صورتوں میں نظر آ رہی ہے۔ اور جب تک "تم" ہو ان مختلف صورتوں ہی میں اس کو دیکھو گے۔ اس طرح ایک اَن پڑھ، گنوار معصوم دیہاتی میں اتنی ہی روحانیت ہے جتنی کہ ایک مہاتما رشی منی میں۔ ایک کیڑے مکوڑے پتنگے بلکہ جھاڑ پہاڑ پتھر میں بھی اتنی ہی روحانیت ہے۔

ع ہر ورق دفتریست معرفتِ کردگار

پس روحانیت کے لحاظ سے کوئی بڑا ہے نہ چھوٹا۔ اگر فرق ہے تو اتنا کہ معصوم دیہاتی اور کیڑے مکوڑے پتنگے جھاڑ پہاڑ تمہاری زبان میں بول نہیں سکتے۔ اس لئے کہ تم ان کی زبان نہیں جانتے اور تم اپنے جیسوں کو بول کر سنا سکتے ہو۔ اس مقام پر بھی جو لوگ درحقیقت اس راز کو سمجھتے ہیں زبان رکھتے ہوئے بھی بول نہیں سکتے۔ اس لئے کہ بولنے کی چیز ہی نہیں۔

آں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد

انسان ایک مشتِ خاک ہے۔ پیدا ہوا تو ایک مشتِ خاک اور مرا تو ایک مشتِ خاک خواہ مہاتما پیغمبر ہوں یا رشی منی۔ جسمانی عقلی اور نفسیاتی طور پر اونچے نیچے ہوتے ہیں۔ جب تک زندہ رہے نیچے کی سطح کے لوگوں کو اوپر کی سطح کا راستہ دکھاتے ہیں۔ لیکن جب ان کو احساس ہوتا ہے کہ وہ دراصل اونچے نہیں ہیں۔ وہ اسی طرح ظہور میں ہیں جس طرح دوسری ہستیاں ہیں تو خاموش ہو جاتے ہیں۔ ابتدا ہی سے بچہ کو غلط تعلیم دی جاتی ہے۔ شروع ہی سے اس کے سر پر مہاتما رشی منی بٹھا دیئے جاتے ہیں۔ اس کے ننھے دماغ

میں یہ بٹھا دیا جاتا ہے کہ وہ کچھ نہیں ہے۔ سب کچھ مہاتما اور رشی منی ہیں۔ بس اس کا دھرم ہے انکی پوجا کرنا اور مہاگانا۔ یہ کوئی اس کو نہیں سوجھاتا کہ بابا تو بھی مہاتما رشی منی بنے گا۔ ان مہاتماؤں اور رشی منیوں سے بڑھا چڑھا ہوگا۔ جو اب تک گزرے۔ تیرا دھرم ہے کہ تو بھی مہاتما رشی منی بن جا۔ جب تک ہمارے بھارت ورش سے یہ مہاتما پرستی نہیں جائے گی چاری موجودہ نسل اور آنے والی نسل آگے نہیں بڑھے گی۔ خواہ سیاسیات میں ہو یا سائنس کی دنیا میں۔ خواہ اخلاقیات میں ہو یا روحانیات میں یہ مہاتما پرستی جانی چاہیئے اور ہر نوجوان ہر بچہ کا یہ رجحان ہونا چاہیئے کہ وہ خود دنیا میں بڑی سے بڑی ہستی بن سکتا ہے۔

جگدیش۔ بے شک۔ ڈاکٹر نند کمار نے ہیرو ورشپ کے خلاف جو دلائل پیش کئے ہیں ان سے انکار کی گنجائش نہیں۔ اور عام طور پر ہمارے یہاں جو ہیرو ورشپ کی فضا پھیلی ہوئی ہے۔ وہ ختم ہونا چاہیئے۔ بغیر اس کے ہمارے ملک کی ترقی ممکن نہیں۔ ہمارے یہاں تو نہ صرف زندوں کی ہیرو ورشپ ہے بلکہ مُردوں کی بھی۔ اسکی وجہ سے کئی نسل گزرے ہوئے اور موجودہ زمانہ میں اس قدر ڈوب جاتی ہے کہ اس کو مستقبل کے متعلق سوچنے کا موقع نہیں رہتا۔ یہ نقص نہ صرف موجودہ تعلیمی ڈھانچہ میں ہے بلکہ تحریر و تقریر کی جو آزادی ہے اُس سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اٹھنے اور ابھرنے والی نسل کو ہیرو ورشپ میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ حجت بھی صحیح نہیں کہ ماضی کو بالکل بھلا کر از سر نو تعمیر شروع کی جائے۔ یہ حال PRESENT خود ماضی کا نتیجہ ہے۔ اور مستقبل جو ہوگا وہ ماضی اور حال کا نتیجہ ہوگا۔ خواہ اس کو کوئی مانے یہ نہ مانے ہم نہ ماضی سے الگ ہیں اور نہ مستقبل میں جدا ہوں گے۔ ایک معمولی بنڈی کا

درمیانی ڈنڈا AXEL بنیاد ہے ریل کی، موٹر کی، ہوائی جہاز کی۔ اس کو بھول جانا حمق ہے۔ لیکن ریل موٹر کار اور ہوائی جہاز کے سامنے ہنڈی کے ایکسل کو پکڑا رہنا ہیرو ورشپ ہے۔ اس لئے دنیا ہم کو گوبری COWDUNGAGE دور کی کہتی ہے۔

ریحانہ۔ روحانیت کو الگ DIMENTION ایک علیحدہ چیز سمجھنے کا نتیجہ یہ ہوگیا ہے کہ جس طرح جسمانی تعلیم ایک پروفیشن بن گئی ہے۔ جس طرح عقلی تعلیم ایک دھندا بن گئی ہے۔ جس طرح نفسیاتی تعلیم ایک کاروبار ہوگیا ہے۔ اسی طرح روحانی تعلیم بھی ایک دھندا بیوپار ہوگیا ہے۔ جدھر دیکھو پیروں کی بھرمار سوامی جی کی بیٹھک۔ گھر بیٹھے اچھی خاصی آمدنی۔ اور آج کل تو چونکہ بہتوں کو روزگار نہیں ملتا۔ اچھے پڑھے لکھے بھی بے روزگار پھرتے ہیں۔ نیز کالجوں میں داخلہ نہیں ملتا۔ پس کسی پیر یا سوامی کے چرن پکڑ لئے جاتے ہیں کہ مراد پوری ہو۔ زندہ پیر یا سوامی نہ صحیح مردہ یا خیالی پیر یا سوامی ہی صحیح اور جب نوجوان نسل کے ماں باپ خود اسی چکر میں پھنسے رہیں تو ان کی آل اولاد بھی یہی کرے گی۔ اور کر رہی ہے۔

پنڈت ہردے ناتھ شاستری۔ آپ نوجوانوں کی گفتگو سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ بالکلیہ مادیت کی طرف بہے چلے جا رہے ہیں۔ یہ سیدھا کمیونزم کا راستہ ہے۔ چونکہ تم میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ اپنے کو صاف طور پر کمیونسٹ کہو تم روحانیت کا سہارا لے رہے ہو اپنی دلیل کو قوی کرنے کے لئے۔ روحانیت کی مضبوط بنیاد اور شاندار عمارت جو ہمارے رشی منیوں نے بنائی تھی۔ اور جو اب تک اپنی جگہ پر ویسی ہی اٹل اور شاندار ہے۔ جیسا کہ اجنتا کے نقش و نگار تم اس کو یک لخت

ڈھا دینا چاہتے ہو۔ بتاؤ تم نے اس کے مقابل کونسی دوسری شاندار عمارت کھڑی کی۔

ڈاکٹر شتند کمار۔ معاف فرمانا شاستری جی۔ ہم کو موقع ہی نہیں دیا گیا اور ہم آپ کو اطمینان دلاتے ہیں کہ سابقہ عمارت کو بلا وجہ ڈھایا نہ جائے گا۔

رات کے دس بج گئے تھے۔ گنگا سرن ودیا النکار نے اٹھتے ہوئے کہا کہ اب کافی دیر ہوگئی ہے۔ ہم لوگوں نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ ان کے اٹھنے کے ساتھ محفل برخاست ہوگئی۔

۱۴

سنہا جی اور سنیہ لتا کو دن رات فکر کھانے لگی۔ سنیہہ لتا ہائی بلڈ پریشر میں مبتلا ہوگئیں۔ اٹھنا بیٹھنا مشکل ہوگیا۔ سر میں چکر رہتا تھا۔ سنہا جی مضبوط دل و دماغ کے آدمی تھے۔ ہمیشہ گمبھیر رہتے۔ لیکن ان کے چہرے پر بھی بشاشت کم ہوگئی۔ خیال ہوا کہ تبدیلِ آب و ہوا سے ممکن ہے کہ سب کی صحت میں فرق ہوجائے۔ پہلے سے ہی ہردوار جانے کا خیال تھا۔ اس موقع پر خیال تازہ ہوگیا۔ صرف سنہا جی اور سنیہ لتا جانا چاہتے تھے۔ جگدیش کے لئے گھر میں نوکر چاکر اور کھانے پینے کا بندوبست تھا۔ لیکن جگدیش نے بھی ہردوار چلنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ جگدیش کے ساتھ نند کشور اور ریحانہ بھی چلنے تیار ہوگئے۔ اب ریحانہ بہت آگے بڑھ گئی تھی۔ اس کا رنگ کچھ اور ہی ہوتا جارہا تھا۔ دنیاوی امور سے اس کا خیال گویا بالکل ہٹ گیا تھا۔ اور ابوالبہا نے بھی اب اس کی راہ میں حائل ہونا مناسب نہیں سمجھا۔ چنانچہ یہ پارٹی اپریل کے مہینے میں نام پلی اسٹیشن سے ہردوار کے لئے روانہ ہوگئی۔ موسم بڑا خوش گوار تھا۔ دلّی پہنچنے پر گرمی بالکل نہیں تھی اور جب ہردوار پہنچے تو ہلکی ہلکی سردیاں تھیں۔ چار روز ہردوار میں رہے۔ ہر روز صبح میں سنہا جی سنیہ لتا

گنگا اشنان کرتے۔ نند کشور اور جگدیش بھی اشنان میں ساتھ رہتے۔ ریحانہ بھی چاہتی تھی کہ گنگا میں نہائے لیکن سنہا جی نے منع کردیا۔ انھوں نے کہا کہ ابوالبہا یہ خیال نہ کریں کہ ریحانہ کو تبدیلِ مذہب کی طرف آمادہ کیا جارہا ہے۔ ریحانہ نے بہت اصرار کیا کہ گنگا دریا میں نہانے سے مذہب کو کیا تعلق ہے۔ لیکن سنہا جی مُصر رہے۔ چنانچہ ریحانہ ہر روز گھر میں ہی نہا لیا کرتی تھی۔ ہردوار سے نکل کر یہ پارٹی پانچویں دن رشی کیش پہنچی۔ سنہا جی کے ایک دوست سریندر رکھنہ کا ایک مکان رشی کیش میں تھا۔ سنہا جی نے پہلے سے کھنہ کو اطلاع دیدی تھی کہ وہ رشی کیش جارہے ہیں۔ چنانچہ کھنہ نے مکان کے نگران کار کو آگاہ کردیا۔ کہ مکان کی پوری طرح صفائی کرادی جائے۔ مکان کافی بڑا تھا۔ اصل مکان میں آٹھ کمرے تھے اور سب کے سب آراستہ۔ اس کے علاوہ متعدد آوٹ ہوز تھے۔ تین ملازم گھر کی صفائی کے لئے تھے۔ ایک نگران کار داروغہ تھا۔ البتہ کھانا پکانے کا بندوبست نہیں تھا۔ لیکن بازار میں تھوری روٹی مل جاتی اور اور کچھ ساگ بھی۔ سنہا جی کی پارٹی اسی مکان میں اتر گئی۔ جس دن یہ پارٹی پہنچی اسی دن معلوم ہوا کہ باباگھنشام داس جی اتر کاشی رشی کیش آئے ہوئے ہیں۔ اور کل شام (۵) بجے ان کا لکچر ہوگا۔

باباگھنشام داس سنیاس لے چکے تھے۔ باباگھنشام داس انگلش لٹریچر میں ڈاکٹریٹ تھے۔ جرمن فرنچ اچھی طرح جانتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ سنسکرت کے بہت بڑے اسکالر تھے۔ پینسٹھ برس کی عمر میں انھوں نے سنیاس لے لیا تھا۔ دوسرے دن وقتِ مقررہ پر جگدیش نند کشور اور ریحانہ باباگھنشام داس کی تقریر سننے پہنچ گئے۔ پہلے سے یہ معلوم نہ تھا کہ باباجی کس موضوع پر تقریر کرنے والے ہیں۔ وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ باباجی

فیا ملی پلاننگ پر تقریر کریں گے۔ سنہہ لتا کو بلڈ پریشر بڑھ گیا تھا، اس لئے سہاجی جا نہ سکے۔ پہلے تو سب کو حیرت ہوئی کہ باباجی فیا ملی پلاننگ جیسے نئے موضوع پر تقریر کریں گے۔ اور یہ حیرت اس وجہ سے تھی کہ لوگ نہیں جانتے تھے کہ باباجی مغربی تعلیم یافتہ بھی ہیں۔ ان کو تو لوگ صرف ایک پرانے قسم کے سنیاسی سمجھتے تھے۔ گنگا کنارے ریت میں بیٹھک کا انتظام کیا گیا تھا۔ ٹھیک وقت پر باباجی تشریف لائے۔ آنے کے ساتھ ہی انھوں نے تقریر شروع کر دی۔

باباجی۔ یہ تصور کہ فیا ملی پلاننگ اب شروع ہوا ہے اور موجودہ دور کی پیداوار ہے غلط ہے۔ انسان جب سے متمدن انسان بنا۔ جب سے انسان میں تہذیب شروع ہوئی اسی وقت سے انسان فیا ملی پلاننگ کرتا آرہا ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ملک کے جدید رہنما جانتے ہی نہیں کہ فیا ملی پلاننگ کیا ہے اور کب سے یہ پلاننگ ہوتی آرہی ہے۔ آپ ہم سب فیا ملی پلاننگ کے پیداوار ہیں۔ ہم جانور کی طرح پیدا نہیں ہوئے۔ فیا ملی پلاننگ کا دوسرا نام شادی ہے۔ شادی کا انسٹیٹیوشن فیا ملی پلاننگ کے لئے ایجاد کیا گیا۔ اور یہ انسٹیٹیوشن ہماری زندگی کا اس طرح جزو لاینفک بن گیا کہ ہم اس کو اپنی زندگی کا ایک اہم لوازمہ سمجھتے ہیں۔ قدیم ہندو شاستر میں شادیوں کی کئی قسمیں تھیں۔ بدلتے ہوئے زمانہ کے حالات کے لحاظ سے ان قسموں میں اضافہ کمی یا تبدیلی ہوتی رہی۔ جب دنیا میں مرد زیادہ اور عورتیں کم تھیں تو ایک عورت کئی مردوں سے شادی کر سکتی تھی۔ اس کے بعد جب دنیا میں مرد کم اور عورتیں زیادہ ہو گئیں تو ایک مرد کئی عورتوں سے شادی کر سکتا تھا۔ پھر مردوں اور عورتوں کی قسمیں بلحاظ ان کے جنسی رجحانات کے بتائی گئیں۔ اور یہ بتایا گیا کہ کون مرد کس قسم کی

عورت سے شادی کرے اور کس قسم کی عورت سے پرہیز کرے۔ اسی طرح کون عورت کس قسم کے مرد سے پرہیز کرے۔ اور کس قسم کے مرد سے شادی کرے۔ پھر عمروں کا تعین کیا گیا کہ کس عمر میں شادی کرنا چاہیئے۔ پھر اوقات کا تعین کیا گیا کہ کن اوقات میں جنسی رجحانات سے کام لیا جانا چاہیئے۔ اس طرح بالکل سائنٹفک طریقہ سے فیا ملی پلاننگ کا ضابطہ موجود ہے۔ یہ بات نہیں کہ فیا ملی پلاننگ کا یہ ضابطہ بالکل اٹل ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ موجودہ زمانہ کے حالات کے لحاظ سے اس امر پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اس ضابطہ میں کیا تبدیلی کیجائے کیا اضافہ کیا جائے۔ کس چیز کی کمی کیجائے۔

ہمارے رہنمایان قوم اندھا دھند جو وازیکٹمی اور کنٹرسیپشو کو رائج کرتے جارہے ہیں کیا وہ سوچ بھی رہے ہیں کہ ان کا عمل کس حد تک سائنٹفک ہے اور کن نتائج کا پیش خیمہ ہے۔

بس ایک قانون بنا دیا کہ   مرد یا عورت ایک سے زیادہ بیوی یا خاوند نہیں کر سکتے کیا اس پر سوچا گیا کہ ملک میں مردوں کی آبادی کتنی ہے اور عورتوں کی آبادی کتنی۔ کتنے مرد رنڈوے ہیں اور کتنے عورتیں بیوہ۔ اگر عورتوں کی آبادی مردوں سے بہت زیادہ ہو تو زائد عورتوں کا کیا حشر ہوگا۔ اسی طرح مردوں کی آبادی عورتوں سے زیادہ ہو تو زائد مردوں کا کیا حشر ہوگا۔ جنسی رجحانات تو بند ہو جانے سے رہے۔ پھر اگر یہ جنسی رجحانات خلاف فطرت افعال کی صورت اختیار کریں اور ان سے جو امراض پیدا ہوں گے ان کے روکنے کی کیا تدابیر اختیار کی جاتی ہیں

آج کل جو شادیاں ہوتی ہیں وہ عورت اور مرد کی جنسی رجحانات کی مناسبت سے نہیں ہوتیں بلکہ شادی بھی ایک ذریعہ معاش بن گئی ہے۔ مرد دیکھتا ہے کہ روپیہ

کمانے والی عورت ہو اور عورت دیکھتی ہے کہ روپیہ کمانے والا مرد ہو۔ ایسی شادیاں سے جو اولاد ہوگی ظاہر ہے کہ وہ قدرتی نشوونما اور صحت کے نقطۂ نظر سے بھی ناقص ہوگی۔ اس پر طرفہ یہ ہے کہ مرد کی ویسکٹمی اور عورت کا اپریشن کرا دیا گیا۔ اب ہر دو ہمیشہ کے لئے اولاد پیدا کرنے سے محروم۔ ایک دو ناقص اولاد کے بعد پیدائش اولاد بند ہو گئی۔ اب ان ایک دو اولاد میں سے کوئی ضائع ہو جائے۔ یا مرض پولیو میں مبتلا ہو جائے تو اس کی تلافی کی کوئی صورت نہیں۔ مرد کی ویسکٹمی اور عورت کے اپریشن کے بعد جنسی کشش بڑی حد تک ختم ہو جاتی ہیں۔ پھر کونسی کشش مرد اور عورت میں باقی رہے گی جس سے خاندان کی یکجہتی جاری رہے۔ یہ تو انفرادی نقصان اور خاندان کی تباہی کی صورت ہوئی۔ قومی اور ملکی مفاد کے نقطۂ نظر سے اگر اس پر غور کیا جائے۔ تو ملک اور قوم کے سرچشمہ دولت کو ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا۔ ہم ملک کے پہاڑ۔ دریا سمندر۔ زمین۔ اشجار سب کو ملک کی دولت سمجھتے ہیں اور اس میں اضافہ کی کوشش کرتے ہیں اور فی الواقع ان سے سب کچھ حاصل کرتے ہیں لیکن دوسری طرف ملک کی اصلی دولت بلکہ سرچشمۂ دولت یعنی انسان کی پیداوار کو روک دیتے ہیں۔ ملک کے پہاڑ، دریا، سمندر اور اشجار سے دولت نکالنے والا انسان ہی ہے۔ اگر اس کی پیداوار روک دو گے تو پھر کون اس دولت کو برآمد کرے گا۔ آپ اطراف دشمنوں سے گھرے ہوئے ہیں دشمن موقع کی تاک میں ہے کہ ذرا آنکھ جھپکی اور چھاپا مارا۔ دشمن بھی کروڑوں، اربوں، کھربوں کی تعداد میں اور دن بدن ان کی تعداد بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ جہاں انسان کی جان کی کوئی قیمت نہیں تو پھر آپ اپنے پاس انسانوں کی پیداوار کو رفتہ رفتہ کم کر کے کس طرح ان مفسدوں کا مقابلہ کرو گے۔

زیادہ زور اس پر دیا جاتا ہے کہ ملک کی غذائی پیداوار ملک کی بڑھتی آبادی کے لئے کافی نہیں ہے۔ اس لئے آبادی کو گھٹایا جائے۔ ورنہ فاقہ کشی ہوگی۔ اور سب ہی بھوکے مریں گے۔ واقعی یہ غور طلب مسئلہ ہے کہ آیا ملک کی غذائی پیداوار کی مقدار کے مدنظر ملک کی آبادی کو گھٹایا جائے۔ یہ بڑا نازک مسئلہ ہے۔

یہ تو ماننا پڑے گا کہ ملک کا MAN POWER ملک کی سب سے بڑی قوت ہے۔ اور ملک کی حفاظت کے لئے یہ مقدم ہے۔ اور یہ MAN POWER بھی تازہ دم اور نوجوان ہونا چاہیئے یعنی ۱۸ سال اور ۳۵ سال کے درمیانی عمر کی جتنی بڑی تعداد ہو ہونا چاہیئے۔ موجودہ فیملی پلاننگ کا جو طریقہ ہے۔ کیا ہم اس کے لحاظ سے ملک کی ۱۸ سالہ اور ۳۵ سال کے درمیانی عمر کی آبادی کو اس سطح پر رکھ سکتے ہیں جس کی ہم کو ملک کے مدافعت کے لئے ضرورت ہے۔ خواہ ملک میں قحط پڑے غذائی پیداوار کم ہو۔ ہمکو تو اس سطح پر آبادی ہونا چاہیئے۔ اور موجودہ فیملی پلاننگ کے طریقہ سے یہ سطح برقرار نہیں رہ سکتی بلکہ ہم نیچے ہی نیچے اترتے جائیں گے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ کیا ملک میں اتنی زمین ہے یا نہیں۔ اتنے ذرائع ہیں یا نہیں جن سے ملک کی غذائی پیداوار بڑھائی جائے۔ ملک کے تینوں طرف سمندر جس میں اتنی مچھلیاں ہیں کہ کئی صدی آپ کو غذا دے سکیں۔ اب بھی بہت کھلی زمین پڑی ہے جس کو ہم شاداب بنا سکتے ہیں اور غذا پیدا کر سکتے ہیں۔ تیسری چیز یہ کہ قدرت کا بھی کوئی نظام ہے۔ ہم اس کو بھلا بیٹھے ہیں۔ قدرت بھی توازن پیدا کرے گی۔ ہماری غذا کے قابل جانور اور پرند اتنے ہیں کہ اگر ہم اصولی طریقوں سے ان کی پرورش کریں تو ہم کو کافی غذا مل سکتی ہے۔ چوتھی چیز ذرائع حمل و نقل ہیں۔

دوسرے یہ کہ نوجوان نسل معاشی جدوجہد اور تعلیمی دوڑ میں اس قدر منہمک ہے کہ ان کے جنسی جذبات بہت کچھ کم ہوتے جارہے ہیں۔ لڑکے اور لڑکیوں میں زیادہ میل جول کی وجہ سے بھی جذبات کم ہوتے جارہے ہیں۔ پھر زندگی میں داخل ہونے کے بعد بھی معاشی کش مکش پیچھا نہیں چھوڑتی۔ یہ بہت بڑی رکاوٹ اولاد کی پیدائش میں آگئی ہے۔ میری رائے میں تعلیم یافتہ طبقوں کی حد تک تو ویسکٹمی عورت کا آپریشن اور کنٹراسپٹو رائج نہیں کیا جانا چاہیئے۔

ایک زمانہ تھا جب کہ عام لوگوں میں جنسی رجحانات کی گویا عادت تھی اور اس کو ابھارنا زندگی کا لازمہ سمجھا جاتا تھا۔ شادی ہونے میں اولین خواہش اولاد کی ہوتی تھی۔ اگر سال دو سال اولاد نہ ہو تو پریشان ہوجاتے تھے۔ اب شادی ہوتے ہی مکان کی تلاش کھانے کپڑے کی تلاش شروع ہوجاتی ہے اس طرح موجودہ زمانہ میں یہ رجحان خود بخود کم ہوتا جارہا ہے۔ بلکہ ڈر ہے کہ آئندہ یہ رجحان اس قدر کم ہوجائے کہ پھر اس کو از سر نو ابھارنے کی ضرورت نہ پڑے۔ بلا وجہ آبادی کے مسئلہ کو ہوا بنا کر کروڑہا روپے جو ضائع کئے جارہے ہیں یہی روپیہ غذائی پیداوار کے اضافہ میں صرف کیا جاسکتا ہے۔ ویسکٹمی اور عورت کا آپریشن واقعی ایک اچھا نسبی علاج ہے۔ اس کے ذریعہ جو لوگ جنسی بیماریوں میں مبتلا ہیں ان کی ویسکٹمی وغیرہ کیجاسکتی ہے۔ اس طرح متعدی امراض کے لوگوں کی ویسکٹمی کی جاسکتی ہے۔ اور قانون کے ذریعہ بھی اس کو عمل میں لایا جائے اس لئے کہ رفاہی کام ہوگا۔ آئندہ نسل محفوظ رہے گی۔ اور خود مریض کے لئے بھی بہتر ہوگا۔ مجمع میں سے ایک شخص نے

ہر قسم کے ذرائع حمل و نسل کا ملک میں جال بچھا دیا جانا چاہیئے۔ خود غرض اشخاص ان سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ملک کے کبھی ایک حصہ میں کبھی دوسرے حصہ میں قحط کے آثار پیدا کردیتے ہیں۔

ایک اور بات میں آپ سے کہتا ہوں وہ یہ ہے کہ فیملی پلاننگ کے جو طریقے اختیار کئے جارہے ہیں وہ صرف چند داغی کام کرنے والے اور چند اونچے درجہ کے اشخاص تک محدود ہیں۔ عوام میں نہ یہ طریقے مقبول ہیں اور نہ ہوسکتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہورہا ہے کہ داغی کام کرنیوالوں کی آبادی گھٹتی جارہی ہے اور جسمانی کام کرنے والوں کی آبادی بڑھتی جارہی ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس مجارٹی اور مینارٹی کے مسائل الگ ہیں۔ اس فیملی پلاننگ کی وجہ سے کوئی مینارٹی دس سال کے بعد مجارٹی بن سکتی ہے اور کوئی مجارٹی مینارٹی ہوجائیگی اس لئے کہ فیملی پلاننگ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ بذریعہ قانون کسی کو اس پر عمل کرنے مجبور کیا جائے۔ جہاں الیکشن کے وقت فرضی اور جھوٹے نام لکھا کر مینارٹی سے مجارٹی بننے کی کوشش کی جاتی ہے تو زیادہ اولاد پیدا کرنے سے کون روک سکتا ہے۔

اب آپ پوچھینگے کہ تنقید تو کی لیکن تعمیری صورتیں کیا ہیں۔ میری رائے میں تعمیری صورتیں دریافت کرنے سے قبل موجودہ حالات کا جائزہ لینا چاہیئے۔ اس وقت عام طور پر کم عمری کی شادیاں تو خود بخود کم ہوتی جارہی ہیں۔ ان پڑھ لوگوں میں ابھی ایسی شادیاں جاری ہیں۔ معاشی کش مکش اور تعلیمی رجحان کی وجہ سے لڑکا لڑکی اب کافی عمر کو پہنچنے کے بعد شادی کرتے ہیں۔ کم از کم تعلیم یافتہ گھرانوں میں یہ حال ہے۔ اس قسم کی شادیوں سے خود بخود اولاد کی پیدائش کم ہوجاتی ہے۔

جو لباس وضع قطع سے مدراسی معلوم ہوتا تھا اُٹھ کر انگریزی میں پوچھا۔

شخص۔ باباجی آپ کی تقریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ سوتنتر پارٹی کی طرف سے آپ پرچار کر رہے ہیں۔ کیا یہ صحیح ہے۔

باباجی۔ نہیں بابا میں پارٹی بازی کے چکر میں نہیں ہوں۔ مغلوں کے زوال کے زمانہ میں پتنگ بازی، بلبل بازی، کبوتر بازی، خمار بازی وغیرہ رائج تھے۔ انگریزوں کے زمانہ میں انگریزوں نے پارٹی بازی شروع کی۔

ہندو پارٹی، مسلم پارٹی، کانگریس پارٹی، سوشلسٹ پارٹی، کمیونسٹ پارٹی کی ہوا چلی۔ انگریزوں نے مجارٹی مینارٹی کا طوق، نکٹائی، کالر کا طوق سوٹ بوٹ کا طوق۔ انگریزی زبان کا طوق ہماری گردنوں میں ڈالا۔ انگریزوں کو ہم نے نکالا نہیں۔ وہ خود چلے گئے۔ لیکن ان کی عطا کردہ پارٹی بازی اور طوق پر اب بھی آپ لوگ فخر کرتے ہیں۔ نہایت افسوس کا مقام ہے۔ اگر میں اس پارٹی بازی کے چکر میں رہتا تو میری جگہ کسی راج دہانی میں ہوتی۔ دنیا چھوڑ کر اس کٹی میں نہ آتا۔

اس کے بعد باباجی نے اپنی تقریر ختم کر دی۔ بابا گھنشام داس نے عرصہ ہوا کہ بڑے مجمعوں کو مخاطب کرنا چھوڑ دیا تھا۔ سیاسی محفلوں سے وہ تقریباً کنارہ کش ہو گئے تھے۔ زیادہ تر ان کی زندگی ہمالیہ کے پہاڑوں میں گزرتی۔ بالکل خاص اور منتخب مجمعوں کو ہی اور وہ بھی بہت اصرار پر مخاطب کرتے تھے۔ اس دن کی تقریر کے بعد سے جگدیش نند کشور اور ریحانہ کا باباجی کے پاس آنا جانا شروع ہو گیا۔ باباجی بھی ان نوجوانوں کی سادگی اور ملنساری پر موہت ہو گئے تھے۔ خصوصاً ریحانہ کی طرزِ زندگی اور اس کی پاکبازی سے بیحد متاثر تھے۔ ریحانہ کی حالت

جوگن کی سی ہو گئی تھی۔ جگدیش بھی بالکل ایک سادھو نظر آنے لگا۔ باباجی ہمیشہ ان لوگوں کو اپنے نزدیک بٹھاتے۔

نند کشور کے دماغ سے ابھی پولٹکس کا چسکا نہیں گیا تھا۔ اس کا دماغ اکثر ملک کے حالات پر غور کرنے میں لگا رہتا۔ لیکن جگدیش اور ریحانہ کے دماغوں سے یہ باتیں دن بدن معدوم ہو رہی تھیں۔ ایک دن کی بیٹھک میں نند کشور نے بابا گھنشام داس سے کہا۔

نند کشور۔ باباجی۔ آج کل ہمارے ملک کے اطراف و اکناف کے حالات سے میرا دماغ اکثر چکرانے لگتا ہے۔ چین ہمارا ملک آہستہ آہستہ ہڑپ کرنے کی فکر میں ہے۔ پاکستان سے اب تک ہماری نہیں بنی۔ سیلون سے بھی تعلقات خاص خوشگوار نہیں۔ جنوبی افریقہ ہم سے نفرت کرتا ہے۔ برما سے ہمارے تعلقات خاص مضبوط نہیں۔ مغربی ممالک میں نہ انگلستان ہمارا خاص دوست ہے اور نہ امریکہ۔ مشرق میں صرف روس کبھی کبھی ہماری تائید میں بولتا ہے۔ وہ بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنی کسی خاص مصلحت کے تحت۔ ایسے موقف میں مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم کس طرح اپنے ملک کو مضبوط بنائیں گے اور صنعتی و زراعتی حیثیت سے ترقی کریں گے۔

بابا گھنشام داس۔ بیٹا۔ دیکھو یہ مسئلہ بین الاقوامی امور سے متعلق ہے۔ یہ بڑا نازک مسئلہ ہے۔ ہماری حکومت نے ایک پالیسی اختیار کی ہے جو بھی یہ پالیسی ہو سب اس کی تائید کر رہے ہیں۔ ملک میں ایسے مسئلہ پر اختلاف رائے سے پالیسی کمزور ہو جاتی ہے اور بالآخر دوسری قوموں کے سامنے اپنے ملک کا پوزیشن گر جاتا ہے۔ اس لئے ایسے مسئلہ کو عام طور پر زیر بحث نہیں لانا چاہئے۔ بہر حال اتنا میں

ضرور کہوں گا کہ خارجی امور میں نہ تو مہاتما بننے سے کام چلتا ہے اور نہ فلاسفر بننے سے خارجی امور میں شاطر کی ضرورت ہوتی ہے نہ کہ مہاتما یا فلاسفر کی۔ دنیا میں اس وقت ایک طرف دنیا کا سب سے زیادہ متمول ملک امریکہ ہے۔ جو نہ صرف دولت میں بلکہ ہنر میں عقل میں سائنس میں سب سے آگے اس پر تازہ دم۔ خطرے کے مقام سے ہزاروں میل دُور۔ پھر انگلستان جس نے باوجود جنگِ عظیم میں مبتلا ہونے کے اور اپنی شہنشاہیت کو چھوڑنے کے اپنے کو تازہ دم اور ہر طرح لیس کر لیا ہے۔ فرانس اور جرمنی جو اپنی اصل حالت پر آ گئے ہیں۔ بلکہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر جرمنی پھر سے پوری طرح آزاد ہو جائے تو پورے یورپ پر حاوی ہو جائے۔ دوسری طرف روس جو سائنس کی ایجادات میں امریکہ سے مقابلہ تو کر رہا ہے۔ لیکن دولت کہاں سے لائے گا۔ جو کچھ بھی دولت اس کے پاس ہے وہ امریکہ سے مقابلہ کی تیاری میں صرف ہوتی جا رہی ہے۔ امریکہ نہ صرف نیا ملک بلکہ دو جنگ کی کمائی ہوئی دولت جو یورپ اور ایشیا دونوں طرف سے آئی اس کے پاس بھری ہوئی۔ جاپان جو امریکہ کے زیر اثر ہے۔ رہا چین بہت غوں غاں کر رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ MAN POWER بہت ہے۔ کیڑوں مکوڑوں جیسی گویا شہد کی مکھیوں کے چھتے کے چھتے۔ لیکن ننگے بھوکے۔ اگر امریکہ یا روس دس ہیڈروجن بم پھینک دیں تو ہمیشہ کی نیند سو جائے۔

امریکہ نے روس کے اطراف ایک حلقہ ڈال دیا ہے جو یورپ سے لیکر ایشیا تک پھیلا ہوا ہے۔ امریکہ چاہتا ہے کہ روس اس حلقہ سے باہر نہ نکلنے پائے اور روس اس حلقہ سے جنگ کے ذریعے نہیں بلکہ دوسرے طریقوں سے

آہستہ آہستہ باہر نکل رہا ہے۔ ہم جیسے چھوٹے اور پچکانی ملک یہ سمجھتے ہیں کہ روس شہنشاہیت چاہتا ہے یا امریکہ شہنشاہیت چاہتا ہے یہ بالکل غلط ہے۔ نہ روس شہنشاہیت چاہتا ہے نہ امریکہ۔ اگر ان ممالک کو شہنشاہیت کی ضرورت تھی یا اُن میں ہمت تھی تو جو ہے وہ شہنشاہیت کیوں چھوڑ دیتے۔ روس یہ چاہتا ہے کہ اپنا مسلک دنیا میں پھیلے اور امریکہ اس کوشش میں ہے کہ روس کا مسلک اس کے اپنے حدود میں رہے۔ روس کو اپنا مسلک پھیلانے کے لئے جنگ کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ جہاں ننگے بھوکے زیادہ ہیں وہاں آسانی سے اس کا مسلک خود بخود پھیل سکتا ہے۔ اس طرح پورا ایشیا اور افریقہ روس کا مسلک پھیلنے کے لئے بہترین مقام۔ امریکہ ان ننگے بھوکوں کی مدد کر کے چاہتا ہے کہ یہ روس کی زد میں نہ آئیں۔ یہ ننگے بھوکے آج کے نہیں صدیوں کے ننگے بھوکے۔ کبھی اِن سے لیا کھایا کبھی اُن سے لیا کھایا بھوک مٹتی ہی نہیں۔ لاکھوں ڈالر لگا دیئے پھر بھی نہیں معلوم کہ دیوار کی بلی کدھر کود دے۔

خواہ روس جنگ کرے یا نہ کرے امریکہ کو جنگی نقطہ نظر سے تو تیار رہنا چاہیئے تاکہ موقع پڑے تو پیچھے ہٹنے کی نوبت نہ آئے۔ اس طرح جنگی ہتیاروں کے تیاری کی دوڑ جاری ہے۔ اور جنگی نقطۂ نظر سے کوئی بھی فوجی افسر یہ نہیں کہہ سکتا کہ دوڑ میں پیچھے رہو۔ خواہ سیاست داں اور ماہرسٹ کچھ کہیں۔

اس طرح شیر اور ببر کی ٹکر کے بیچ میں ہم ہیں۔ پھر ہم کیا ہیں صدہا برس غلامی میں رہے۔ انگریزوں کی غلامی میں دو سو برس رہے۔ امریکہ نے ہماری آزادی کی جدوجہد میں ہمارے ساتھ ہمدردی ظاہر کی۔ اس واسطے کہ امریکہ خود ایک

آزاد شدہ قوم تھی اور اس لئے دوسری قوموں کا غلام بنے رہنا پسند نہیں کرتی تھی۔ لیکن بہ نسبت امریکہ کے انگریز ہمارے طبائع اور خصائل سے زیادہ واقف تھے۔

ہم دو کیمپ میں منقسم تھے۔ ایک سرمایہ داروں کا اور دوسرا سوشلسٹ کا۔ شروع سے انگریزوں نے بھانپ لیا تھا کہ مسلم لیگی سرمایہ داری کی تائید کریں گے اور کانگریس سوشلزم کی طرف جائے گی۔ اب اگر وہ ہندوستان کو بغیر تقسیم کے آزاد کرتے تو پورا ملک سوشلسٹ ہو جاتا۔ جیسا کہ اس وقت ہندوستان ہے۔ اگر کشمیر میں ہندوستان اور پاکستان کا جھگڑا نہ کھڑا کیا جاتا تو روس کے اطراف کشمیر میں فوجی پڑاؤ کے مقامات کس طرح ملتے۔

ہندوستان کی پالیسی کے لحاظ سے تو کشمیر میں فوجی پڑاؤ Base ہرگز نہ ملتا یہ تو ناممکن تھا کہ روس کو حلقہ سے باہر آنے دیا جائے۔ امریکہ نے اس گر کو بعد میں سمجھا۔ صاف معلوم تھا کہ ہندوستان کا بہاؤ کدھر ہے اور پاکستان کا رجحان کدھر ملک کے لئے سوشلسٹ طرز نظام ہونا چاہیے یا سرمایہ دارانہ نظام یہ مسائل تو وہ قومیں سوچیں گی جو بالغ ہو چکی ہیں۔ ابھی ہم کم پیدا ہو کر پندرہ برس نہیں ہوئے قوموں کی زندگی میں پندرہ برس پندرہ دن کے برابر بھی نہیں ہوتے۔ پنجرے سے چھوٹے ہیں پنجرہ توڑ کر بھی باہر نہیں نکلے۔ قطع نظر اس سے خود سوشلزم کا نظریہ دو سو برس پرانا جس کو کارل مارکس نے پیش کیا لینن اور انجل نے اپنایا۔ اس آٹھ لک زمانے میں سوشلزم کے پرانے نظریہ پر چلنے کی کوشش کرنا اس کو توڑ مروڑ کر صحیح اور مفید پالیسی نہیں ہو سکتی۔

علاوہ بریں شیر اور ببر کے بیچ میں اگر بکری تقسیم کرانے جائے تو دونوں بھی اس کو کھا جائیں گے۔ بس ہماری پالیسی یہی ہوگی کہ شیر اور ببر کی ٹکر کی زد میں نہ

آئیں اور ساتھ ہی ہم بھی شیر بننے کی کوشش کریں۔ ایک دن میں تو آپ بکری سے شیر نہیں بن جائیں گے۔ صدیوں کی غلامانہ ذہنیت جاتا ہے۔ ابھی تو سب کو کھانا کپڑا بھی میسر نہیں ہے۔ سب سے مقدم چیز غذا ہے۔ دو وقت کی دال روٹی اول چاہیئے۔ اس دال روٹی میں بھی پیٹ کاٹو گے تو غلامانہ ذہنیت کیسے جائے۔ کل کے سبز باغ دکھا کر آج کی دال روٹی بھی کم کر دو گے تو فطرتِ انسانی کے خلاف بات ہوگی۔ ایسی پالیسی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ پس اگر شیر دانت دکھائے تو کہیں ہاں تو شیر تیرا باپ دادا شیر۔ اور ببر منہ کھولے تو کہیں بے شک تو ببر تیرا دادا ببر۔ بکری بننے سے کام نہیں چلتا بلکہ لومڑی بننا پڑے گا۔ شیر اور ببر کو اگر آپ لکچر دینے لگیں تو بکری کا حال ہوگا۔ ہم کو تو اس وقت غذائی پیداوار بڑھانا ہے۔ سب کو روٹی دینا ہے۔ بیروزگاری دور کرنا ہے۔ خصوصاً تعلیم یافتوں کی بے روزگاری۔ اس کے ساتھ ہی جدید سائینٹفک معلومات سے پوری طرح واقف ہونا ہے۔ یہ چند اشارے میں نے کر دیئے ہیں۔ اس سے زیادہ واضح نہ میں کہنا چاہتا اور نہ مناسب ہے۔ باباجی گفتگو ختم کر رہے تھے کہ نند کشور نے پوچھا۔

نند کشور۔ باباجی۔ ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے زمانہ میں عدم تشدد اور اہنسا پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ مہاتما گاندھی نے تو اہنسا کو جدوجہد آزادی کا اہم اصول بنا دیا تھا۔ اور اکثر یہی کہا جاتا ہے کہ ہم نے ہندوستان کی آزادی عدم تشدد سے جیتی۔ یہ بات اب تک سمجھ میں نہیں آئی۔ ہندوستان کی تقسیم میں خون کی ندیاں بہیں۔ کشمیر کی جدوجہد میں لاکھوں ہزاروں کٹ گئے حیدرآباد کے پولیس ایکشن میں خون ریزی ہوئی۔ گوا میں تشدد ہی استعمال کرنا پڑا۔

باباجی۔ مہاتما گاندھی جس عدم تشدد کا پرچار کرتے تھے وہ بہت اونچی بات ہے۔ ہم معمولی انسانوں کی سطح سے بہت بہت اونچی ہے۔ مہاتما گاندھی نے تو اس مسلک کو اپنی ذات کی حد تک بالکل اپنا لیا تھا۔ اور اس پر عمل کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کے عام لوگوں کو بھی اس سطح پر لائیں۔ لیکن تم جانتے ہو کہ دنیا میں کتنے اوتار ہوئے، پیغمبر آئے اپنے اپنے مسلک پیش کئے۔ لیکن دنیا جہاں کی تہاں بہت برائی پھیل جاتی ہے تو ایسے اوتار آتے ہیں اور ایک حد تک برائی دور ہوتی ہے۔ لیکن پھر مشل پانی کے انسان اپنی معمولی سطح پر آجاتا ہے۔

عدم تشدد کے مسئلہ میں مہاتما گاندھی ہندوستان کو جس سطح پر لیجانا چاہتے تھے ابھی اس کے لئے ہندوستان تیار نہیں تھا۔ چنانچہ مہاتما گاندھی کی شہادت اس کا نتیجہ ہے۔

میں تو عدم تشدد کے مسئلہ کو اس طرح سمجھتا ہوں کہ تشدد نام ہے غصہ کا۔ کرودھ کا انسان میں جیسے دوسری خاصیتیں ہیں غصہ بھی اس کی ایک خاصیت ہے۔ اگر انسان میں غصہ نہ ہو تو دنیا اس کو کھا جائے۔ اور قدرت نے یہ خاصیت کسی ضرورت کے لئے دی ہے لیکن ہمکو اپنی کسی خاصیت کے غلام نہیں ہو جانا چاہیئے خواہ اچھی خاصیت ہو یا بری۔ اگر تم غصہ کی خاصیت کے غلام ہو گئے بالفاظ دیگر اگر تم پر غصہ غالب آجائے تو تم تباہی کی طرف چلے جاتے ہو۔ غصہ نہ ہونے سے تم کو دوسرے کھا جائیں گے۔ مہابھارت کی جنگ ہوئی۔ جتنی ذاتی خواہشات تھیں۔ مال کی دولت کی حکومت کی۔ یہاں تک کہ غصہ کی۔ سب کی نفی ارجن نے کردی۔ پھر بھی جنگ ہوئی اور جنگ بھی ایسی جس میں بھائی نے بھائی کو مارا چچیرے نے گورو کو مارا۔ بھتیجے نے چچا کو مارا۔ خاندان کے خاندان تباہ و برباد

ہو گئے۔ غصہ کی خاطر نہیں بلکہ اصول کی خاطر دھرم کی خاطر۔ اسی طرح حضرت علیؓ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ کسی دشمن کو قتل کرنے جا رہے تھے۔ دشمن بالکل ان کے قابو میں تھا۔ اس نے ان کے منہ پر تھوک دیا۔ حضرت علیؓ نے اس کو چھوڑ دیا۔ اس دشمن شخص نے دریافت کیا کہ وہ کیوں چھوڑ دیا گیا۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ وہ اس کو اصول اور دھرم کے لئے قتل کر رہے تھے۔ جب اس نے تھوک دیا تو انھیں غصہ آگیا۔ اب ان کا فعل نفس کے تابع ہو گیا۔ یعنی غصہ سے مغلوب ہو گئے تھے۔ اس لئے اس کو چھوڑ دیا۔

بس یہی اصول ہر جگہ ہونا چاہیئے۔ ہم نے کشمیر میں غصہ کے تحت لڑائی نہیں کی حیدرآباد یا گوا میں کسی نفسانی جہت سے کارروائی نہیں کی گئی۔ بلکہ عین اصول اور دھرم کے لئے کارروائی کی گئی جو قومی حیثیت سے انسانی حیثیت اور بین الاقوامی حیثیت سے ضروری تھی۔ میرے خیال میں عدم تشدد اور اہنسا کا صحیح منشا یہی ہے۔ کم از کم ہم معمولی انسانوں کے لئے۔ اس سے اونچا جانے کی ابھی ہم میں صلاحیت نہیں ہے۔

ہر شخص کو اس سنسار میں اپنا کرتو پالن کرنا ہے اور بس۔ تمہارا کرتو اس سنسار سے بیزار ہونا گھبرانا اور بھاگنا نہیں ہے۔ اس سنسار میں آئے ہو تو پوری طرح رہو۔ اچھا دیکھو بُرا دیکھو۔ اصل میں نہ کوئی اچھا ہے نہ بُرا۔ تصویر کے مختلف رُخ ہیں دیکھتے جاؤ۔ نہ کسی سے بھاگنے کی ضرورت نہ کسی سے چھپتے رہنے کی حاجت۔ ریحانہ بھی اب وہ ریحانہ نہیں تھی۔ جو حیدرآباد سے رشی کیش آئی تھی۔ اس میں بھی تازگی اور زندگی کے آثار نمودار ہونے لگے۔ نند کشور میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔ نہ تو رشی کیش آنے سے پہلے اس میں کوئی خاص بات تھی اور نہ یہاں آنے کے بعد کوئی خاص بات پیدا ہوئی۔ وہ تو اپنا حق دوستی ادا کر رہا تھا۔ اور اپنے بہن کی محبت سے وفاداری کا ثبوت دے رہا تھا۔ سنہاجی اور سنہہ لتا جگدیش میں یہ تبدیلی دیکھ کر بہت خوش ہونے لگے۔ ان کے امیدوں کی کلی شگفتہ ہونی شروع ہوئی۔ پھر بھی وہ جگدیش سے راست اس معاملہ میں بولنا نہیں چاہتے تھے۔ ریحانہ کا جگدیش پر بہت اثر تھا۔ ریحانہ کی بات کو جگدیش ٹال نہیں سکتا تھا۔ ریحانہ اب صحیح معنی میں جگ آپا تھی۔ سنہاجی اور سنہہ لتا تو بس اس کے گرویدہ تھے۔ ریحانہ نے سنہاجی کے گھر میں کرانتی کی جگہ لے لی تھی۔ سنہاجی اور سنہہ لتا نے طے کیا کہ ریحانہ کے ذریعہ سے بات شروع کریں۔ ریحانہ کو معلوم تھا کہ اب سنہاجی کے گھر میں بہو کی ضرورت ہے۔ دونوں کافی بوڑھے ہو گئے تھے۔ انیتا نظر میں تھی ہی۔ انیتا سے متعلق تفصیلات ریحانہ کو کہہ دے گئے۔ چنانچہ ریحانہ اور نند کشور نے جگدیش کو انیتا سے شادی کر لینے پر راضی کر لیا۔ جب سنہاجی کو اطلاع دی گئی کہ جگدیش راضی ہو گیا ہے تو دوسرے ہی دن سنہاجی نے رشی کیش سے واپسی کا ارادہ کر لیا۔ شام کو پانچ بجے کی ٹرین سے یہ پارٹی حیدرآباد کے لئے روانہ ہو گئی۔ چوتھے دن صبح حیدرآباد نام پلی اسٹیشن پہنچے۔ موٹر ٹیکسی کر لی گئی۔ نند کشور اور

۱۵

رشی کیش کی فضا بڑی خوش گوار تھی۔ موسم بھی بہت اچھا تھا۔ ہمالیہ کی چوٹیوں سے ایک سہانا پن برستا تھا۔ دامن میں گنگا نہایت دھیمی رفتار سے بہتی تھی۔ صبح اور شام گنگا کنارے بڑا خوب صورت منظر رہتا۔ زندگی کی نہ تو کوئی ہلچل نظر آتی تھی اور نہ بھاگ جو عام شہروں میں دکھائی دیتی ہے۔ ایسا معلوم پڑتا تھا کہ زندگی ایک خاموش اور گہرا سمندر ہے۔ کھانا سادہ۔ کپڑا سادہ۔ اوڑھنا بچھونا سادہ۔ جگدیش کی طبیعت سنبھلنے لگی۔ پژمردگی جو اس کے اندر ہی اندر کنکھیوں سے دکھائی پڑتی تھی اب دُور ہو رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پھر سے پودا ہرا ہو رہا ہے۔ سنت اور مہاتماؤں کی صحبت کا جو رشی کیش میں جگدیش کو مل رہی تھیں بہت اچھا اثر ہوا۔ دنیا کا ثبات اور اس کی بے ثباتی اب اس کو صحیح زاویہ نگاہ سے نظر آنے لگے۔ اگر حقیقی سنت اور مہاتما مل جائیں تو ان کی تقریر سے زیادہ ان کی خاموش صحبت سے فائدہ پہنچتا ہے۔ اور اصل سنت و مہاتما بولتے کم ہیں۔ ان کی روزمرہ کی زندگیاں خود اپنی زبان حال سے سب کچھ بولتی ہیں۔ اور ان کے ستسنگ سے زندگیاں بدل جاتی ہیں۔ اب جگدیش کو محسوس ہونے لگا کہ اس سنسار میں کئی جگدیش اور کئی دمینتی آئے اور گئے اور کئی جگدیش اور کئی دمینتی آئیں گے اور جائیں گے۔

ہر شخص کو اس سنسار میں اپنا کرتو پالن کرنا ہے اور بس۔ تمہارا کرتو اس سنسار سے بیزار ہونا گھبرانا اور بھاگنا نہیں ہے۔ اس سنسار میں آئے ہو تو پوری طرح رہو۔ اچھا دیکھو برا دیکھو۔ اصل میں نہ کوئی اچھا ہے نہ برا۔ تصویر کے مختلف رُخ ہیں دیکھتے جاؤ۔ نہ کسی سے بھاگنے کی ضرورت نہ کسی سے چمٹے رہنے کی حاجت۔ ریحانہ بھی اب وہ ریحانہ نہیں رہی۔ جو حیدرآباد سے رشی کیش آئی تھی۔ اس میں بھی تازگی اور زندگی کے آثار نمودار ہونے لگے۔ نند کشور میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔ نہ تو رشی کیش آنے سے پہلے اس میں کوئی خاص بات تھی اور نہ یہاں آنے کے بعد کوئی خاص بات پیدا ہوئی۔ وہ تو اپنا حق دوستی ادا کر رہا تھا۔ اور اپنے بہن کی محبت سے وفاداری کا ثبوت دے رہا تھا۔ سنہاجی اور سنہہ لتا جگدیش میں یہ تبدیلی دیکھ کر بہت خوش ہونے لگے۔ ان کے امیدوں کی کلی شگفتہ ہونی شروع ہوئی۔ پھر بھی وہ جگدیش سے راست اس معاملہ میں بولنا نہیں چاہتے تھے۔ ریحانہ کا جگدیش پر بہت اثر تھا۔ ریحانہ کی بات کو جگدیش ٹال نہیں سکتا تھا۔ ریحانہ اس وقت صحیح معنی میں جگ آپا تھی۔ سنہاجی اور سنہہ لتا تو بس اس کے گرویدہ تھے۔ ریحانہ نے سنہاجی کے گھر میں کرانتی کی جگہ لے لی تھی۔ سنہاجی اور سنہہ لتا نے طے کیا کہ ریحانہ کے ذریعہ سے بات شروع کریں۔ ریحانہ کو معلوم تھا کہ اب سنہاجی کے گھر میں بہو کی ضرورت ہے۔ دونوں کافی بوڑھے ہو گئے تھے۔ انیتا نظر میں تھی ہی۔ انیتا سے متعلق تفصیلات ریحانہ کو کہہ دی گئیں۔ چنانچہ ریحانہ اور نند کشور نے جگدیش کو انیتا سے شادی کر لینے پر راضی کر لیا۔ جب سنہاجی کو اطلاع دی گئی کہ جگدیش راضی ہو گیا ہے تو دوسرے ہی دن سنہاجی نے رشی کیش سے واپسی کا ارادہ کر لیا۔ شام کو پانچ بجے کی ٹرین سے یہ پارٹی حیدرآباد کے لئے روانہ ہو گئی۔ چوتھے دن صبح حیدرآباد نام پلی اسٹیشن پہنچے۔ موٹر ٹکسی کر لی گئی۔ نند کشور اور

ریحانہ کو ان کے گھروں پر چھوڑتے ہوئے سنہاجی سنہہ لتا اور جگدیش اپنے گھر آئے۔ حمام وغیرہ سے فراغت پانے کے بعد جب سنہاجی نے اپنے میز پر نظر ڈالی تو شادیوں کے رقعے پڑے ہوئے تھے۔ سب رقعے دیکھے گئے۔ کئی رقعوں میں شادی کی تاریخ گزر گئی تھی۔ کسی میں ابھی تاریخ آئندہ تھی۔ ان رقعوں میں ایک رقعہ انیتا کی شادی کا تھا۔ شادی کی تاریخ گزر چکی تھی۔

دوسرے دن ریحانہ جگدیش کے گھر آئی۔ انیتا کی شادی کی خبر سن کر بہت مایوس ہوئی۔ لیکن جگدیش بہت خوش تھا۔ ریحانہ کو دیکھتے ہی کہنے لگا۔

جگدیش۔ دیکھو ریحانہ آپا۔ میں نہ کہتا تھا۔ جس جوت کو دنیتی نے میرے ہردے میں جلایا وہ امر ہے۔ آپ سب نے اس کو دبانے کی کوشش کی۔ لیکن یہ جوت امر ہو گئی ہے اور ہمیشہ میرے ہردے میں جلتی رہے گی۔